گاہے گاہے باز خواں ......

ڈاکٹر اسرار احمد کے ۱۹۶۹ء کے بعض سیاسی تجزیے

کیا پاکستان میں دوبارہ ۷۰-۱۹۶۹ء کے حالات پیدا ہو رہے ہیں؟

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم و میثاقہ الذی واثقکم بہ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن ——— لاہور

PEPSI

MIRINDA

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۴ / ۲۳۹۳۱

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق

لاہور

رجسٹرڈ

جلد ــــــ ۳۴

شمارہ ــــــ ۱۰

اکتوبر ۱۹۸۵ء

بمطابق

محرم الحرام ۱۴۰۶ھ

زر سالانہ
۳۰/ روپے

فی شمارہ ۳/ روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

چودھری رشید احمد

مکتبہ تنظیمِ اسلامی

۳۶ کے. ماڈل ٹاؤن
لاہور ۱۴ فون ۸۵۲۶۸۳

سب آفس ، ۱۱ - داؤد منزل ، نزد آرام باغ ، شاہراہ لیاقت کراچی ، فون ۲۱۶۵۸۶

مشمولات

❖ تذکرہ وتبصرہ ———— ۳

ڈاکٹر اسرار احمد

❖ مکتوب گرامی ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنّی
بنام مولانا سعید الرحمٰن علوی ———— ۱۳

❖ پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش اور اسلام ———— ۱۵

میثاق جنوری تا مئی ۱۹۶۹ء کے اداریوں سے اقتباس

از قلم : ڈاکٹر اسرار احمد

❖ الہدیٰ (نشست نمبر ۲۵) ———— ۵۵

اثبات آخرت سورہ قیامہ کی روشنی میں (۲)

ڈاکٹر اسرار احمد

❖ 'صبر محض' سے 'اقدام' تک ———— ۶۵

بسلسلۂ اسلامی انقلاب : مراحل، مدارج اور لوازم

ڈاکٹر اسرار احمد

❖ شادی بیاہ کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک
اور۔ اس سے متعلق بعض تنقیدات کا جائزہ ———— ۷۷

مولانا سعید الرحمٰن علوی

❖ رفتارِ کار ———— ۸۵

امیر تنظیم اسلامی کا نو روزہ دورہ بلوچستان

مرتب : سید برہان علی

❖ ماہنامہ "سیارہ ڈائجسٹ" سے ڈاکٹر اسرار احمد کا انٹرویو ۹۵

❖ افکار و آراء ———— ۱۰۹

اسرار احمد

تذکرہ و تبصرہ

راقم الحروف نے 'میثاق' کی ادارت ۱۹۶۶ء میں سنبھالی تھی ـــــ اور اس کے زیر ادارت 'میثاق' کا پہلا شمارہ جولائی ۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ گویا اس کے 'زیر اہتمام' ـــــ 'میثاق' کو شائع ہوتے یہ بیسواں سال ہے۔

اس طویل عرصے کے دوران سوا بارہ برس تک یہ بالکلیہ میرے ہی اہتمام، میری ہی ادارت اور میری ہی ترتیب کے مطابق شائع ہوا۔ بعد ازاں (اکتوبر ۷۸ء سے) راقم الحروف اس کا صرف "مدیر مسئول" رہ گیا۔ ترتیب وغیرہ کی جملہ ذمہ داری بھی رفیق مکرم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے برداشت کی اور اشاعت کے لئے بیشتر مواد بھی انہوں نے ہی میری تقاریر اور دروس کو کیسٹوں سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے فراہم کیا ـــــ تاہم اس دور میں بھی گاہے گاہے راقم خود اپنی تحریروں کے ذریعے "تذکرہ و تبصرہ" کے صفحات میں حاضری دیتا رہا۔

اس سب کے باوصف، واقعہ یہ ہے کہ راقم جس طرح نہ مروجہ معنی میں سیاسی آدمی ہے، نہ معروف معنی میں 'عالم دین' ـــــ بالکل اسی طرح وہ اصطلاحی مفہوم کے مطابق 'صحافی' بھی نہیں ہے۔

یہ تذکرہ اس لئے نوک قلم پر آگیا کہ گذشتہ اشاعت میں راقم نے عرض کیا تھا کہ چونکہ اس کے اندازے کے مطابق عنقریب پاکستان کے سیاسی حالات کے اعتبار سے تاریخ اپنے آپ کو دہرانے والی ہے اور دوبارہ کچھ اسی قسم کے حالات و واقعات پیش آنے والے ہیں جو ۶۹ء میں رونما ہوئے تھے، اور راقم کے اس ضمن میں بھی بعض سوچے سمجھے نظریات ہیں جن سے 'میثاق' کے موجودہ قارئین کی اکثریت واقف نہیں ہے، لہٰذا قبل اس کے کہ راقم اب اس موضوع پر قلم اٹھائے، ان شاء اللہ آئندہ ہی اشاعت میں راقم اپنے ان سیاسی تجزیوں کے بعض حصے دوبارہ شائع کر دے گا جو اس نے اس زمانے میں تحریر کئے تھے تاکہ ریکارڈ درست رہے اور یہ نہ کہا جا سکے کہ یہ سب کچھ خیالات کی ایک وقتی اور فوری سی لہر کا مظہر ہے" ـــــ تو جب اس خیال سے راقم نے 'میثاق' کے پرانے فائلوں پر نظر ڈالی تو اسے جولائی ۶۸ء کی اشاعت میں اپنی ایک تحریر نظر آئی جسے پڑھ کر واقعہ یہ ہے کہ دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کے شکر و حمد کے احساسات ابھرے کہ سوا سترہ سال گذر جانے کے باوجود آج بھی راقم کے قلب و ذہن اور احساسات

وجذبات کی کیفیت " اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ " کے مصداق بالکل وہی ہے جو اُس وقت تھی چنانچہ موجودہ سیاسی تجزیوں سے قبل راقم نے مناسب سمجھا کہ وہ اپنے احباب و رفقاء اور ' میثاق ' کے جملہ قارئین کو بھی اپنے اس گہرے احساسِ شکر و حمد میں شریک کرنے کے لئے اپنی وہ تحریر مِن وعَن نقل کر دے۔

ـــــ وھو ھٰذا

" گزشتہ شمارے کے ساتھ راقم الحروف کے زیر ادارت ' میثاق ' کے دو سال مکمل ہو گئے تھے اور زیر نظر اشاعت سے تیسرے سال کی ابتدا ہو رہی ہے۔ دو سال کی اس مدت میں ' میثاق ' کے ذریعے اگر دین کی کوئی بُری بھلی خدمت ہوئی ہے تو وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہے ـــــ اور اگر کسی کوتاہی یا غلطی کا صدور ہوا ہے تو وہ یقیناً میری نا اہلی اور شرارتِ نفس کی بنا پر ہے۔ آئندہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی کی امید اور اس کے اس حتمی وعدے پر پختہ یقین کی بنا پر کہ:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ۶۹)

" اور جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کریں گے ہم لازماً انہیں اپنے راستوں پر چلائیں گے "

اس دعا کے ساتھ اس سفر کو جاری رکھنے کا عزم ہے کہ:

رَبَّنَا اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ (آمین)

" پروردگار، ہمیں حق کو حق دکھا اور اس کی پیروی کی توفیق عطا فرما اور باطل کو باطل دکھا اور اس سے بچنے کی ہمت عطا فرما۔"

' صحافت ' نہ تو راقم الحروف کا ' پیشہ ' ہے اور نہ ' مشغلہ '۔

جہاں تک کسبِ معاش کا تعلق ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے وہ ذریعہ عطا فرمایا تھا جو سب کے نزدیک دنیا کا شریف ترین پیشہ ہے۔ پھر میرے بارے میں کسی نے چاہے اور کچھ بھی کہا ہو، مجھ پر غبی ہونے کا الزام آج تک کسی نے نہیں لگایا ـــــ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ اپنے دورِ تعلیم کے انتہائی اہم زمانے میں میں ایک تحریک اور اس کی دعوت سے متاثر ہوا اور فوری طور پر میں نے پورے فہم اور شعور کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا ـــ کہ میری زندگی میں اوّلیت اس تحریک اور اس کی دعوت کو حاصل ہوگی۔ معاش اور کسبِ معاش کے ذریعے (یعنی PROFESSION & CAREER) کو بالکل ثانوی مقام حاصل ہوگا۔ تعلیم کے اختتام اور عملی زندگی کے آغاز کے بعد بھی قلب کی گہرائیوں سے اُبھرنے والے بعض تقاضوں اور روح کی پہنائیوں سے اٹھنے والے بعض مطالبوں

نے مسلسل بے چین کئے رکھا۔ چنانچہ مروّجہ معیارات کے مطابق 'پیشہ ورانہ کامیابی' کے بنیادی لوازم ـــــ یعنی توجہ کا ارتکاز ـــــ اور ایک مقام پر مستقل قیام ـــــ کبھی پورے نہ کئے جاسکے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دوران میں جب بھی کبھی ایسا ہوا کہ پیشہ ورانہ معروفیت میں اضافہ ہوتا اور وقت اور توجہ کا معتدبہ حصّہ اس میں صرف ہونے لگتا تو قلب و روح کی گہرائیوں سے وہی صدا بلند ہونے لگتی جو ایک روایت کے مطابق شکار کے دوران ایک بیابان میں حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کو سنائی دی تھی کہ:

یا ابراھیمُ! اَلھٰذا خُلِقتَ اَمْ لھٰذا اُمِرْتَ ؟

(اے ابراہیم! کیا اسی کام کے لئے تمہیں پیدا کیا گیا ہے۔ یا کیا اسی کا تمہیں حکم ملا ہے؟)

نتیجۃً طبیعت میں توحش پیدا ہو جاتا ـــــ اور پیشہ ورانہ معروفیت سے دل بالکل اچاٹ ہو جاتا ـــــ معاش میں استحکام ـــــ اور پیشہ و فن میں تمکن کا اصل زمانہ یعنی اختتام تعلیم سے لے کر مسلسل دس بارہ سال تک کا عرصہ میں نے اس حال میں گزارا کہ جہاں کی فضا اپنے 'مقصدِ زندگی' کے لئے نسبتاً زیادہ سازگار نظر آئی اپنا سارا بوریا بستر سمیٹ کر وہاں چل دیا اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ ایک مقام پر ایک عرصہ تک قیام کی بنا پر معاشی و فنّی اعتبار سے جو حیثیت بنی ہے اس کو اس طرح نظر انداز کر دینے سے معاشی مستقبل کتنا مخدوش ہو جائے گا ـــــ حد یہ ہے کہ ایک بار 'مقصدِ زندگی' کے نام پر دی جانے والی ایک دعوت کی بنا پر پیشہ و فن کی پوری بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی ـــــ الغرض مسلسل آج یہاں، کل وہاں، پرسوں کہیں اور، اور اگلے روز کہیں اور کی حالت طاری رہی ـــــ لوگ تلوّن اور غیر مستقل مزاجی کی پھبتیاں کستے رہے۔ لیکن میں اپنے باطن کا جائزہ لیتا تو یہ معلوم کر کے مطمئن ہو جاتا رہا کہ میرے اس ظاہری 'تلوّن' کا اصل سبب بحمداللہ اپنے اس قدیم فیصلے پر پوری 'مستقل مزاجی' کے ساتھ عمل پیرا رہنا تھا کہ میری زندگی میں اوّلیت بہرحال 'مقصدِ زندگی' کو حاصل رہے گی۔ معاش اور اس کے متعلقات ہمیشہ ثانوی رہیں گے! ـــــ ایک طویل عرصے تک ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد آج سے دو ڈھائی سال قبل حکمتِ خداوندی اور مشیتِ ایزدی کے تحت یہ صورت پیدا ہوئی کہ میں لاہور منتقل ہوا ـــــ اور یہاں مقصدِ زندگی کے لئے 'خالص ذاتی حیثیت' میں ایک حقیر جدوجہد کے آغاز کے طور پر پہلے "تحریکِ جماعت اسلامی" کی اشاعت اور پھر 'میثاق' کے از سرِ نو اجراء کا اہتمام کیا ـــــ!

رہا 'شوق' کا معاملہ۔ تو خدا جانتا ہے کہ 'لکھنے' کا شوق مجھے کبھی نہیں رہا۔ اس کے

برعکس واقعہ یہ ہے کہ لکھنا، مجھے ہمیشہ ایک نہایت مشکل اور نہایت کٹھن کام نظر آیا۔ نہ تو یہ کبھی میرا مشغلہ (HOBBY) رہا۔ اور نہ ہی کبھی میں نے اس کی مشق کی اور واقعہ یہ ہے کہ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ اس 'فن' کے ابجد تک سے میں تاحال ناواقف ہوں۔ اسلامی جمعیتِ طلبہ سے وابستگی کے دوران خالص تنظیمی نوعیت کی چند تحریروں یا ایک آدھ واردات قلبی کے اظہار کے قبیل کی چیزوں کے علاوہ پورے زمانہ طالب علمی میں میں نے کچھ نہیں لکھا ——— اس کے بعد مسلسل دو سال ایک حرف بھی قلم سے نہ نکلا۔ لیکن پھر اچانک مقصد زندگی کی لگن اور اس کے ساتھ شدید ذہنی وابستگی سے 'یہ معجزہ' صادر ہوا کہ اکتوبر ۵۶ء میں دس پندرہ دن کی مدت میں سوا دو سو صفحات پر مشتمل وہ بیان تحریر میں آگیا جو اب 'تحریکِ جماعتِ اسلامی' کی صورت میں مطبوعہ موجود ہے ——— اس کے بعد مسلسل دس سال پھر اس حال میں گزرے کہ ایک حرف بھی قلم سے نہ نکلا۔ حتیٰ کہ اس پورے عرصہ میں خطوط بھی چند بالکل گنے چنے ہی لکھنے میں آئے ——— تا آنکہ جولائی ۶۶ء میں 'میثاق' کا دوبارہ اجراء عمل میں آیا۔ اس کے بعد کی قلمی داستان سے قارئین 'میثاق' بخوبی واقف ہیں۔

یہ پوری داستان بے اختیار اس لئے نوکِ قلم پر آگئی کہ حال ہی میں چند مخلصین نے یہ شکوہ کیا ہے کہ "رسائل واخبارات کے اداریئے وقتی حالات و مسائل پر تبصرے کے لئے ہوتے ہیں، تم ان میں بھی ثقیل مضامین بھر کر 'صحافت' کے معروف اصولوں کو توڑ رہے ہو"۔ اور بعض دوسرے حضرات نے یہ طعنہ دیا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے پاس 'لکھنے' کے لئے کچھ ہے ہی نہیں" ——— میری گذارش اپنے ان تمام دوستوں اور بزرگوں سے یہ ہے کہ واقعتہً 'صحافت' نہ میرا 'پیشہ' ہے نہ 'مشغلہ' ——— لہٰذا صحافت کے مروّجہ معیارات کے مطابق میری جانچ پرکھ مجھ پر شدید زیادتی ہے۔ علامہ اقبال کو جو گلہ اپنے دوستوں سے تھا کہ ؎

مرا یاراں غزل خوانے شمردند !!

وہی مجھے اپنے ان مخلصوں سے ہے کہ وہ مجھے بھی ایک صحافی سمجھ رہے ہیں، میں نے ہرگز صحافت کا شوق پورا کرنے کے لئے اس کوچے میں قدم نہیں رکھا۔ بلکہ 'میثاق' کا اجراء صرف اپنے مقصدِ زندگی کے حصول کی جد وجہد کے لئے کیا ہے۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس وسیع وعریض دنیا میں اپنے مقصد اور اس کی جد وجہد سے بڑھ کر اہم چیز کوئی نظر ہی نہیں آتی! موجودہ حالات و واقعات میرے نزدیک بذاتہٖ اور فی نفسہٖ نہ کوئی علیحدہ وجود رکھتے ہیں نہ مستقل اہمیت کہ ان پر تبصرہ کسی

افادیت کا حامل ہو۔ مجھے اس ایک مقصد کے سوا کسی چیز سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے کہ مسلمان جیوں اور مومن مروں۔ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ خود میرا سینہ بھی نورِ ایمان سے منوّر ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے قلوب و اذہان بھی اسی نور سے جگمگا اٹھیں۔ تاکہ وہ بھی اسلام پر زندہ رہیں اور ایمان پر اس دنیا سے رخصت ہوں۔ پھر کوئی جماعت یا تنظیم ایسی مل جائے جو اس مقصد کے لئے کام کرنا چاہتی ہو تو کیا کہنا! ۔ بصورتِ دیگر میں تن تنہا اسی مقصد کے لئے کام کرتے رہنے ہی کو اصل کامیابی و سعادت و فلاح سمجھتا ہوں چاہے پوری زندگی کی جدوجہد کے بعد بھی اس کا کوئی محسوس و مشہود نتیجہ سامنے نہ آئے۔"

راقم الحروف خود بھی اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہے اور جملہ رفقاء و احباب اور قارئینِ 'میثاق' سے بھی استدعا کرتا ہے کہ وہ اس کے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح بالکلیہ اپنے فضل و کرم سے راقم کو ستمبر ۱۹۸۵ء میں اپنی جون ۱۹۶۸ء کی ایک تحریر کے آئینے میں "وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلاً" کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی ہے اسی طرح تا اختتامِ حیاتِ دنیوی اور "یَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ" اسے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں اپنے ان محبوب بندوں کا کفشِ بردار بنا دے جن کی شان میں یہ الفاظِ مبارکہ سورۂ احزاب میں وارد ہوئے ہیں:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	ایمان والوں میں کتنے ہی مرد ہیں جنہوں
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ	نے سچ کر دکھایا اپنا وہ عہد جو اللہ سے
مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ	کیا تھا، تو کوئی تو انہیں سے پورا کر چکا اپنا
يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝	ذمہ اور کوئی ہے (اس کا) منتظر اور نہیں
(الاحزاب : ۲۳)	تبدیلی کی انہوں نے ذرہ برابر۔

جہاں تک موعودہ سیاسی تجزیوں کا تعلق ہے تو راقم نے جب 'میثاق' کے پورے فائل کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ یہ تو (حفیظ جالندھری مرحوم سے معذرت کے ساتھ) "خمسِ صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں!" کے مصداق بہت طوالت طلب معاملہ ہے اور ان سب کا ایک اشاعت میں شائع کر دینا تو سرے سے ناممکن ہے ہی، سب کی اشاعت ضروری بھی نہیں ہے۔

——— راقم نے گذشتہ سوا نیس سالوں کے دوران جو سیاسی یا تجزیاتی تحریریں سپردِ قلم کی ہیں ان کا جائزہ (BREAK - UP) حسبِ ذیل ہے:

۱۔ ۱۹۶۷-۶۸ء کے دوران جو سیاسی اور ثقافتی تجزیئے 'میثاق' میں شائع ہوئے وہ "اسلام

اور پاکستان" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع شدہ موجود ہیں۔

۲۔ ۱۹۶۹ء میں جنوری تا مئی کی اشاعتوں میں جو خالص سیاسی تجزیئے شائع ہوئے ان کا ایک انتخاب اکتوبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں دوبارہ "پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش اور اسلام" کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا۔ اسی کو اب ٹھیک پندرہ سال بعد ایک بار پھر پیش نظر اشاعت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے لئے اُسی وقت کی شائع شدہ تحریروں کا عکس من وعن شائع کیا جا رہا ہے تاکہ یہ بات مستقل طور پر ذہن میں رہے کہ یہ تحریریں آج کی نہیں، ۱۹۶۹ء کی ہیں!

ان تجزیوں کی اس وقت بھی بہت پذیرائی ہوئی تھی۔ (چنانچہ اِس وقت کے معروف سیاسی رہنما اور اُس وقت کے صحافی و دانشور اور ابھرتے ہوئے سیاسی کارکن جناب حنیف رامے نے ان میں سے بعض کو من وعن اپنے ہفتہ وار جریدے "نصرت" میں شائع کیا تھا) اور ان شاء اللہ اب بھی قارئین "میثاق" انہیں نہ صرف دلچسپ پائیں گے بلکہ اس اعتبار سے مفید بھی پائیں گے کہ ان کے آئینے میں وہ "آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ!" کی کیفیت محسوس کریں گے!

۳۔ ۱۹۷۰ء میں جب پاکستان کی سیاست میں واقعتہً گھمسان کے رَن کی کیفیت پیدا ہو گئی تو اس سال کی بھی چند اشاعتوں میں تفصیلی تجزیئے شائع ہوئے جن میں زیادہ تر اس وقت کی برسرِ پیکار سیاسی جماعتوں کا تجزیہ تھا۔ ان کا بھی ایک انتخاب راقم نے مرتب تو ابھی کر لیا ہے لیکن ان کی اشاعت کافی الحال ارادہ نہیں ہے۔ (ہو سکتا ہے کہ آئندہ کسی مرحلہ پر ان کی اشاعت مفید محسوس ہو)۔

۴۔ البتہ جون ۱۹۶۹ء میں راقم کی جو تحریر "میثاق" کے "تذکرہ و تبصرہ" کے صفحات میں شائع ہوئی تھی اس میں قضیۂ مشرقی پاکستان اور خود پاکستان کی ہیئت ترکیبی اور اس میں مضمر پیچیدگیوں کے بارے میں بعض نہایت اہم مباحث شامل تھے، ـــــ اسی طرح جب دسمبر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ پیش آ ہی گیا تو اس پر جو مفصل تبصرہ جنوری فروری ۱۹۷۲ء کی مشترک اشاعت میں شائع ہوا تھا اس میں بھی بعض مباحث نہایت اہم ہیں، جن کا فہم و شعور موجودہ "بچے کھچے" پاکستان میں چلنے والی علاقائی و نسلی قومیتوں کے تصور پر مبنی علیحدگی پسند یا مرکز گریز تحریکوں کے پس منظر کے فہم و ادراک کے لئے نہایت ضروری ہے ـــــ چنانچہ ان شاء اللہ العزیز یہ دونوں تحریریں بشمول اپنے اس خط کے جو اس نے ان تحریروں

کے ٹھیک دس سال بعد (دسمبر ۸۲ء میں) پاکستان کے موجودہ صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جناب ضیاء الحق صاحب کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ اور جس میں راقم نے عرض کیا تھا کہ سندھی نوجوانوں میں بالکل بنگلہ دیش کی تحریک کے مماثل سندھو دیش کی تحریک جڑ پکڑ چکی ہے اور یہ لاوا کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ (چنانچہ ایک سال کے اندر اندر یہ صورت فی الواقع پیدا ہو بھی گئی تھی، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے پاکستان کو بچا لیا اور ہمیں اصلاحِ حال اور تلافیٔ مافات کا ایک مزید موقع عنایت فرما دیا) ——— "میثاق" کی آئندہ اشاعت میں قارئین کی خدمت میں پیش کر دی جائیں گی۔

پاکستان کے ۱۹۶۹ء کے سیاسی حالات کے ضمن میں اپنے متذکرہ بالا تجزیوں کے ساتھ، راقم اس اشاعت میں بطور ضمیمہ بھارت کے دو مؤقر مسلم جرائد کے تبصرے بھی شائع کر رہا ہے تاکہ پاکستان کے اُس دَور کے سیاسی حالات کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے طرزِ فکر کی ایک جھلک بھی قارئین کے سامنے آجائے۔

"استحکامِ پاکستان" کے موضوع پر راقم الحروف کی جن تقاریر کا ذکر گذشتہ شمارے میں آیا تھا ان پر محترم اقبال احمد صدیقی صاحب نے بہت محنت کی ہے اور انہیں ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کا کام تقریباً مکمل کر لیا ہے۔ لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر خود ان کا اور بعض دوسرے رفقاء کا اصرار ہے کہ ان پر میں بھی ایک نظر ضرور ڈالوں اور ہو سکے تو انہیں خود از سرِ نو مرتب کروں، چنانچہ خود میرا ارادہ بھی اب یہی بن گیا ہے، لیکن اس کی تکمیل ظاہر ہے کہ سراسر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس ہی کی تائید و توفیق پر منحصر ہے، بلکہ ؎ "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے!" کے مصداق میرے دل میں تو یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ اگر اللہ حالات سازگار فرما دے تو ماہِ اکتوبر میں عمرہ کے لئے سفر کروں اور اس کے دوران حرم کے کسی گوشے ہی میں بیٹھ کر اس تقریر کو مرتب کروں۔ وَمَا ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!!

اس اثنا میں لاہور کی 'شامِ الہدیٰ' والی تقریر کو وڈیو کیسٹ کے ذریعے جن حضرات نے دیکھا اور سُنا، ہے ان میں سے علماءِ ہند کے خیر آبادی سلسلے کی ایک عظیم شخصیت مولانا حکیم برکات احمد ٹونکیؒ کے پوتے حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کا جو تأثر موصول ہوا ہے وہ ہدیۂ قارئین ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم المقام ' السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

محترم ..... صاحب کے یہاں آپ کی تقریر سُنی۔ حسبِ ارشاد اپنے تأثرات عرض کر رہا ہوں ——

واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک غیر معمولی تقریر ہے۔ تقریر میں عالم اسلام کی اسلامی تحریک یا تحریکوں' تحریکِ پاکستان اور پاکستان کے حال اور مستقبل کا آپ نے جو جائزہ لیا ہے وہ بھرپور ہے' ہمہ جہتی ہے' جامع ہے' متوازن ہے اور یہ جائزہ خالص دینی نقطۂ نگاہ سے اور ایک مسلمان کی نگاہ سے ہے' خیالات اور تبصرے توازن اور دیانت کے ساتھ آپ کی سیاسی بصیرت اور وسعتِ نگاہ پر بھی دال ہیں۔ اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ مقرر کو دین کے ہر خادم (فرد یا جماعت) سے ہمدردی اور تعلقِ خاطر ہے مگر ساتھ ہی وہ تنقید میں بے باک بھی ہے !!!

اس تقریر کو جلد تحریر میں بدل کر شائع کر دیجئے .....

میں اس مفصل اور مربوط تقریر پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

۵ ستمبر ۸۵ء خاکسار' محمود احمد برکاتی "

کراچی کے جس اجتماع میں یہ تقریر سُنی اور دیکھی گئی اس میں مولانا حکیم برکات احمد ٹونکیؒ کے دو معنوی اور علمی پوتے بھی شریک تھے یعنی ایک ان کے شاگردِ رشید مولانا معین الدین اجمیریؒ کے تلمیذِ رشید اور راقم کے استاذ مولانا سید منتخب الحق قادری مدظلہٗ اور دوسرے مولانا معین الدین اجمیریؒ کے بھتیجے اور میرے مشفق حکیم محمد نصیر الدین ندوی! ان دونوں بزرگوں کا بھی اگر کوئی تبصرہ موصول ہوا تو قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا

خیر آبادی مکتبِ فکر کے جس اجتماع کا اعلان گذشتہ ماہ کیا گیا تھا اب اُسے ذرا مؤخر کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ ایک تو تا حال مولانا سید منتخب الحق مدظلہٗ کی جانب سے پروگرام کی توثیق موصول نہیں ہوئی اور دوسرے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے راقم نے ماہ اکتوبر میں عمرہ کی نیت کر لی ہے' —— لہٰذا اس سلسلے میں اب پروگرام از سرِ نو ترتیب دینا ہوگا۔

مولانا سعید الرحمٰن علوی اس ماہ اپنی بعض خاندانی مصروفیات کے باعث کافی عرصہ لاہور سے باہر رہے۔ لہٰذا ان کی جس طویل اور سلسلہ وار تحریر کی قسطِ اوّل گذشتہ ماہ شائع ہوئی تھی اس کی قسطِ

ثانی اس شمارے میں شامل نہیں کی جا سکی، یہ انشاء اللہ آئندہ ماہ شائع ہوگی ـــــــ البتہ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں ان کی ایک علمی اور تحقیقی تحریر شاملِ اشاعت ہے۔

بلوچستان کے ایک تفصیلی دورے اور علاقائی اجتماع سے حد درجہ تکان کے ساتھ واپسی ہوئی ہی تھی کہ تنظیمِ اسلامی کے سالِ رواں کے علاقائی اجتماعات کے سلسلہ کی تیسری کڑی یعنی اجتماعِ پشاور سر پر ہے اور راقم کی کیفیت 'پا برکاب' کی سی ہے۔ بلوچستان کے دورے اور اجتماعِ کوئٹہ کی مختصر روداد اس شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ اجتماعِ پشاور کی روداد ان شاء اللہ آئندہ ماہ شائع ہوگی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب تک اس دنیا میں رکھے اپنے دین کی خدمت کے لئے قبول کئے رکھے ـــــ اور جب یہاں سے دار الخلد کو روانگی ہو تو ایمان کے ساتھ ہو۔

ولدی السعید عزیزم عاکف سعید سلمہٗ کے بچے اور راقم کے پوتے حسین عاکف کے انتقال پر، جو اسی سال ماہِ رمضانِ مبارک میں ہوا تھا، چونکہ بہت سے رفقاء و احباب نے تعزیتی خطوط ارسال فرمائے تھے۔ لہٰذا راقم اپنے جملہ رفقاء و احباب کو اپنی اس خوشی میں بھی شامل کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزیزم عاکف سعید سلمہٗ کو نعم البدل کے طور پر ایک بیٹا ۹ ستمبر ۸۵ء کو بوقتِ سحر عطا فرما دیا ہے۔ ہم نے اس کا نام بھی 'حسین' ہی رکھا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نومولود کو مومن و مسلم بنا کر اٹھائے اور اسے بھی اپنے دین کی خدمت کے لئے قبول فرمائے۔

ع گر قبول افتد زہے عز و شرف

پرچہ مکمل ہو چکا تھا ـــــ اور کاپیاں جوڑی جا رہی تھیں کہ مولانا سعید الرحمٰن علوی کے نام محترم ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی (ایبٹ آباد) کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ ڈاکٹر صاحب راقم کے بزرگ اور دیرینہ کرم فرما ہیں، لہٰذا طبیعت میں شدید داعیہ پیدا ہوا کہ ان کے جذبات قارئین تک ضرور پہنچا دیئے جائیں اگرچہ اس کے لئے 'سفر بلوچستان' کی روداد کے بعض حصّے حذف کر کے جگہ نکالنی پڑی ـــــ!!!

استحکامِ پاکستان

کے موضوع پر امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی جمعہ ۲ اگست کی واپڈا آڈیٹوریم کی تقریر

(۱)

بصورت ویڈیو کیسٹ

پاکستان ٹیلیویژن کے ایک سینئر کیمرہ مین کی پروفیشنل ریکارڈنگ

نیشنل NV 180 کیسٹ : قیمت -/۲۵۰ روپے

(۲)

بصورت آڈیو (عام) کیسٹ

TDK کے C-90 کے دو کیسٹ : قیمت -/۷۰ روپے

نوٹ: بذریعہ ڈاک منگوانے کی صورت میں پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔

ادارہ نشر القرآن ، ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن لاہور

مکتوبِ گرامی

ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنّی بنام مولانا سعید الرحمٰن علوی

محترمی! زندہ باد

مدت ہوئی کہ کوئی تقریب ہاتھ نہ آئی کہ آپ سے نصف ملاقات کا شرف حاصل کر سکتا۔ اب کہ 'میثاق' میں 'دل افگندیم' پڑھا۔ تقریب حاصل ہو گئی اور عریضہ لکھنے کا موقع مل گیا۔

کچھ مدت سے آپ کی نگارشات "میثاق"۔ خاص کر "حکمتِ قرآن" میں پڑھتا رہا اور اپنے ردِّ عمل سے آپ کو آگاہ کرتا رہا، گویہ تعلق ہوا کا رُخ بتا رہا تھا لیکن یہ معلوم نہ کر سکا کہ آپ تنظیمِ اسلامی سے ملحق ہو جانے والے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب میرے کرم فرما ہیں۔ اور میں ان کے مشن کا ہم نوا آغاز کار (غالباً ۱۹۷۰ء) سے ہوں اور اُن کے مشن کا مخلصانہ خیر خواہ، قلمے و درمے بھی تھا۔ خدا نے ان کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان کی اسی صلاحیت کا اثر ہے کہ انہوں نے آپ جیسے شہبازِ علم کو شکار کر لیا۔ یہ کتبِ قرآن کی کرامت ہے یا امیرِ تنظیمِ اسلامی کی فراستِ مومنانہ کہ انہوں نے آپ کی رفاقت حاصل کر لی۔ اب یقیناً ان کے مشن کو توانائی ملے گی۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔ اس قِرانُ السعدین کو خدا مبارک کرے۔ آمین!

آپ نے اپنی (Bio Data) تفصیل۔ خاندانی، تعلیمی، مجاہدانہ سرگزشت بیان فرمائی۔ گویا اسمار الرجال علماء و شیوخ کا ایک دفتر کھل گیا۔ آپ کے اساتذان اور مربیان تو ایک سلک مروارید ہے۔ جن میں نامور علماء اور عالی قدر شیوخ شامل ہیں۔

ذاتی طور پر، میں خانقاہ سراجیہ مجددیہ کندیاں کے مقامِ علم و معرفت سے باخبر ہوں۔ اس کے کتب خانہ کی شہرت کو خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے سجّادہ نشین صاحبان بھی صاحبِ علم و معرفت ہوئے۔ علم کو تو ویسے بھی خدا کے یہاں عبادت پر افضلیت حاصل ہے لیکن جہاں علم و عبادت کے دو بحرین ساتھ ساتھ جاری ہوں وہاں لُؤلُؤ اور مرجان ہی نکلتے ہیں۔

آپ نے صوفی عبدالحمید صاحب اور ان کے برادرِ اکبر کا ذکر بھی فرمایا۔ ان دونوں اساطین علم سے غائبانہ تعارف اور عقیدت رکھتا ہوں اور اسے اپنے لئے منفرد اعزاز جانتا ہوں۔ حضرت مولانا سواتی صاحب نے توازراہ کرم خود ہی اپنی اور حضرت مولانا صفدر کی تصانیف

مدت ہوئی، ہدیۃً ارسال فرما کر زیرِ بار احسان فرمایا اور اس کے بعد ان سے تعلق خاطر دن بدن زیادہ ہو رہا ہے۔ مولانا سورتی کے دروسِ قرآن کی انفرادیت سے میں بہت متاثر ہوا۔ ان کے بعض تفسیری نکات تو اس سے پہلے کہیں بھی مجھے نظر نہ آئے۔

پھر آپ کے تعلق کا مولانا غلام غوث ہزاروی خدامست درویش و عالم، سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے والا مجاہد، فخرِ ہزارہ ہی نہیں، فخرِ پاکستان کی زندگی کا کیا کہنا۔ ان سے واقفیت ۱۹۲۹ء سے تھی۔ وہ کلمۂ حق گزشتہ دور کے آمرِ مطلق کے سامنے کہہ سکتے تھے۔ جہاں مشہور جگر و گردے والے سیاست دان بھی خاموش رہتے تھے۔ یہی مردِ حق تھا جس نے مجلسِ عام میں، جب وہ آمر پیالۂ شراب بدست آیا۔ تو پیالہ اس کے ہاتھ سے چھین کر فرش پر دے مارا اور کہا "جہاں غلام غوث ہو گا وہاں کوئی شراب نہیں پی سکتا۔ وہ آمر جو اپنے شراب کے جواز کے لئے علامہ پر ہر وقت پھبتیاں کستا رہتا تھا:

"صبح حلوہ، شام حلوہ، دن حلوہ، رات حلوہ! میں تو کبھی کبھی تھکان دور کرنے کے لئے، تھوڑی سی شراب پی لیتا ہوں۔"

یہ عریضہ جواب طلب نہیں۔ بلکہ دعا طلب ضرور ہے۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا والسلام طالبِ دعا: شیر بہادر پنی

(بقیہ: ڈاکٹر اسرار احمد کا انٹرویو)

بلیک میل کرنا شروع کر دیا تو خدانخواستہ پاکستان ہی ختم ہو جائے گا تو کم از کم اس وقت مارشل لاء پاکستان کے عمل چل تو رہا ہے۔ یہ ہیں ان لوگوں کے فلسفے۔ اسی لیے کوئی ادھر اتحاد کر رہا ہے اور کوئی ادھر اتحاد کر رہا ہے۔ میں اپنا تجزیہ بیان کر چکا ہوں کہ ہمارے ہاں مذہبی عناصر جتنے بھی ہیں وہ سیاسی تحریکوں کے ضمیمے بن گئے ہیں۔ اب یا تو کوئی ضیاء الحق کا ضمیمہ ہے اور کوئی ایم آر ڈی کا۔ اور انہوں نے وہ فلسفے تراشنے شروع کر دیئے کہ اسلامی ریاست اور اسلامی جمہوریت ہے ہی نہیں۔ یہ درحقیقت دوسروں کو سپورٹ کر رہے ہیں۔ ایک طبقے نے ضیاء الحق کی اسلامائزیشن کو بہت غنیمت سمجھا ہے اور اس کی بہت حمایت کی ہے۔ یا پھر یہ ہے کہ بعض طبقے ایم آر ڈی کا ضمیمہ بن گئے ہیں۔ کچھ لوگ بیچ بیچ میں رہ گئے ہیں۔ میرے نزدیک پاکستان کی بنیاد خالص اسلام پر ہے اور اگر اس میں اسلامی انقلاب نہ آیا تو خدانخواستہ میرے نزدیک اس کا خاتمہ یقینی ہے۔ یہ اپنا تشخص کھو بیٹھے گا۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

پاکستان کی

موجودہ سیاسی کشمکش

اور

اسلام

میثاق، جنوری تا مئی ۶۹ء کے اداریوں سے اقتباسات

ڈاکٹر اسرار احمد

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝
(یہ تو بس ایک یاد دھانی ہے)

(۱)

پاکستانی سیاست کا دورِ جدید
اور — ہوا کا نیا رُخ

تذکرہ و تبصرہ - میثاق، جنوری ۱۹۶۹ء

(۲)

عوامی ایجی ٹیشن سے
دوسرے مارشل لا کے نفاذ تک

— بعض اہم حوادث و واقعات

تذکرہ و تبصرہ "میثاق" فروری، مارچ ۱۹۶۹ء سے ماخوذ

(۳)

جمہوریت، سوشلزم اور اسلام

(ایضاً)

ضمیمہ

پاکستان کے سیاسی حالات پر دو مسلم بھارتی جرائد کے تبصرے

پاکستانی سیاست کے دورِ جدید کا آغاز

اور

ہوا کا نیا رُخ

تذکرہ و تبصرہ 'میثاق' جنوری ۱۹۶۹ء سے ماخوذ

اب سے ڈھائی تین ماہ قبل پاکستان کی سیاسی فضا میں جو زبردست طوفانی ہلچل پیدا ہوئی تھی اس کا زور تو اگرچہ اب کم ہو گیا ہے اور دوبارہ کچھ ویسی ہی سکون آمیز کیفیت سیاسی میدان پر طاری ہو گئی ہے جیسی کسی بڑے طوفان باد و باراں کے بعد فضا پر طاری ہوتی ہے[1]۔ تاہم اس طوفان نے سیاسی میدان کے بہت سے گوشوں کو نکھار دیا ہے اور بہت سے زیرِ سطح رجحانات کو سطح پر لا کر نمایاں کر دیا ہے —— 'میثاق' اگرچہ ملکی سیاسیات سے بالعموم زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا۔ تاہم اس وقت جو صورتِ حال سامنے ہے اس سے بالکل صرفِ نظر بھی ممکن نہیں —— بنابریں ہم بعض مسائل و معاملات کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

میدانِ سیاست کی اس حالیہ سرگرمی کی ابتدا کچھ تو واقعتہً طوفانی انداز کی تھی اور کچھ اس بنا پر بہت زیادہ طوفانی محسوس ہوئی کہ ایک عرصے سے ہمارے ملک میں سیاست کے میدان پر قبرستان کی سی خاموشی طاری تھی —— ورنہ ظاہر ہے کہ ہر آزاد ملک میں کچھ نہ کچھ سیاسی سرگرمی تو ہر وقت ہی جاری رہتی ہے جو انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں بھی کبھی کبھی طوفانی انداز اختیار کر لیتی ہے (جیسا کہ حال ہی میں فرانس میں ہوا تھا!) رہے درمیانی درجے کے ممالک تو ان میں تو اکثر و بیشتر سیاست چلتی ہی اس انداز پر ہے۔ مثلاً ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان میں سال بھر کے دوران شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب اس کے کسی نہ کسی حصے میں بالکل اسی طرح کی صورتِ حال موجود نہ رہتی ہو جیسی ہمارے یہاں اس طوفان کے ابتدائی دنوں میں تھی —— ہمارے یہاں چونکہ ایک طویل

---

[1] اگرچہ کچھ نہیں کہا جا سکتا ممکن ہے کہ یہ سکوت و سکون کسی دوسرے طوفان کا پیش خیمہ ہی ثابت ہو!

عرصے کے تعطل کے بعد سیاسی سرگرمی کا آغاز ہوا تھا لہٰذا کچھ قدرتی نفسہ تیز و تند (RASH) تھی اور کچھ انتظامیہ بھی اس کے لئے تیار نہ تھی۔ چنانچہ اس کی جانب سے صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے میں شدید غلطیاں ہوئیں۔ نتیجۃً آگ مزید بھڑکی اور کچھ ایسا سماں بندھا کہ ایک بار تو بالکل ایسے محسوس ہوا جیسے صدر ایوب کی حکومت خاتمے پر ہے اور پاکستان فوری طور پر کسی نئی سیاسی و انتظامی صورتِ حال سے دوچار ہونے والا ہے ——— لیکن رفتہ رفتہ صورتِ حال سنبھل گئی۔ چنانچہ ایک طرف کچھ تو ایجی ٹیشن کا زور مدھم پڑا اور کچھ حکّام سنبھلے اور دوسری طرف کچھ اپوزیشن کی اپنی صفوں کے بعض رخنے منظرِ عام پر آئے اور کچھ حکومت کی اعلیٰ ترین سطح کی جانب سے بھی سیاسی گفتگو پر آمادگی کا اظہار ہوا ——— نتیجۃً حالات و واقعات نے کسی فوری اور ہنگامی معاملے کی بجائے مسلسل اور مستقل سیاسی سرگرمی کی صورت اختیار کر لی ——— !!

ہمارے نزدیک سیاسی میدان کی یہ سرگرمی بجائے خود ملک و ملت کے حق میں ایک فالِ نیک ہے۔ قبرستان کی سی خاموشی یا جیل کا سا "سب اچھا!" حکمرانوں کے نقطۂ نظر سے چاہے کتنا ہی خوش آئند ہو کسی آزاد ملک اور زندہ قوم کے حق میں زہرِ ہلاہل سے کسی طرح کم نہیں

ہمارے نزدیک عوام کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملکی و قومی مسائل سے بھرپور دلچسپی لیں اور اپنے بھلے اور برے کے بارے میں خود سوچیں۔ اپنے ملک کے انتظامی معاملات کا ضبط اور اپنی قومی پالیسیوں کے رُخ کا تعین عوام کا حق ہی نہیں فرض ہے ——— اور خاص طور پر پاکستان ایسے زیرِ ترقی ملک میں تو اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ عوام انتظامیہ پر نہ صرف یہ کہ کڑی نظر رکھیں بلکہ اسے پوری طرح لگام دے کر رکھیں ورنہ سیاسیات کے اس مشہور و مسلّمہ اصول کے مطابق کہ "اختیار و اقتدار میں بے راہ روی کا رجحان فطری طور پر موجود ہوتا ہے اور اقتدارِ مطلق تو قطعاً بے راہ ہو کر ہی رہتا ہے[1]!" ایک بے لگام اور بگٹٹ انتظامیہ کا بے راہ اور کج رو ہونا قطعی و یقینی ہے !!

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دس سالوں میں ملکی سیاست کے بازار میں خاصی رونق رہی تھی اور وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ "پارلیمانی سیاست" کی گہما گہمی اور حالات کی تبدیلی اور واقعات و حوادث کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا ——— اگرچہ مضبوط اور محکم سیاسی جماعتوں کے فقدان کے باعث میدانِ سیاست کی یہ ساری گرما گرمی خیر کے بجائے شر پیدا کرتی چلی گئی۔ جس کا منطقی نتیجہ ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا

ہم نے مئی ۶۷ء میں ان ہی صفحات میں ۵۸ء کے اس فوجی انقلاب کی نوعیت، اس کے اسباب و علل اور عواقب و نتائج کے بارے میں جو رائے پیش کی تھی وہ حسبِ ذیل ہے :-

---

[1] "Authority tends to corrupt; and absolute authority corrupts absolutely"

"میدان سیاست کے اس اختلال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر رفتہ رفتہ سروسز کے جانب منتقل ہوتی چلی گئی۔ تا آنکہ ۵۸ء میں جنرل ایوب نے تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے کر فوجی حکومت قائم کر دی اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر ایک طرف حکومت کا پورا نظم و نسق کلیۃً سروسز کے حوالے کر دیا اور دوسری طرف بنیادی جمہوریت کے نظام کے ذریعے سیاسی حقوق اور اختیارات کو تدریجاً عوام کے جانب منتقل کرنے کا وہی سلسلہ از سر نو شروع کیا جس پر تقریباً نصف صدی قبل غیر ملکی حکمران عمل پیرا ہوتے تھے — گویا پاکستان کی عوامی سیاست ایک دم واپس نصف صدی قبل کے مقام پر پہنچ گئی! ملی اور قومی نقطۂ نگاہ سے یہ صورت حال یقیناً نہایت تشویشناک اور پریشان کن ہے اور ہر مخلص اور محب وطن پاکستانی کو لازماً اس پر سخت مضطرب اور غمگین ہونا چاہیے۔ لیکن اس حقیقت کو ہر آن پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس کا اصل سبب قوم میں سیاسی شعور کی خطرناک حد تک کمی اور ملی و قومی احساسات کا خوفناک حد تک فقدان ہے! کسی ایک یا چند افراد کے سر اس پوری صورت حال کی ذمہ داری تھوپ دینا یا سیاسی بے بصیرتی کا شاہکار ہے یا علمی خیانت کا!"

بہرحال مارشل لا کے نافذ ہوتے ہی فطری طور پر ملکی سیاست کا بازار ایک دم بند ہو گیا اور تمام سیاسی حلقے موت و زیست کی کشمکش سے دوچار ہو گئے۔

مارشل لاء تو ہمارے ملک میں اگرچہ چند ہی سال جاری رہا اور چاہے کسی کو پاکستان کے موجودہ دستور سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو بہرحال یہ ایک واقعہ ہے کہ ۱۹۶۲ء سے ہمارے ملک میں باقاعدہ ایک دستوری حکومت قائم ہے —— لیکن بالکل ایسے جیسے حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد بھی ایک عرصے تک جنوں اور شیطانوں پر ان کی ہیبت و دہشت کے اثرات قائم رہے تھے۔ ہمارے سیاسیین کو بھی مارشل لاء کے صدمے سے ہوش میں آنے میں کافی وقت لگا —— اور مارشل لاء کے خاتمے کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک ملک کی سیاست کے میدان میں مکمل سرد بازاری کا سماں طاری رہا!

یہ واقعہ ہے کہ مارشل لا کے صدمے سے سب سے پہلے ہوش میں آنے والی جماعت "جماعت اسلامی" تھی جو سیاسی جماعتوں پر سے پابندی اٹھ جانے کے فوراً بعد ایک "منظم" جماعت کی حیثیت سے برسرکار ہو گئی —— اور یہ اس لئے ممکن ہو سکا کہ اس کے کارکنوں نے مارشل لا کے دوران بھی کسی نہ کسی صورت میں اپنی اجتماعیت کو برقرار رکھا تھا —— دوسرے نمبر پر حرکت میں آنے والا گروپ نظام اسلام کا تھا —— مسلم لیگ کے احیا کی کوشش ہوئی تو وہ فوراً سرکاری اور مخالفِ سرکار دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ رہے پاکستان کے اکثر قدیم خاندانی اور پیشہ ور سیاست دان تو ان کی اکثریت صورت حال کو کچھ زیادہ امید افزا نہ پا کر بدستور

گوشۂ عافیت میں دبکی رہی۔

سنہ ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے موقع پر سنہ ۱۹۵۸ء کے بعد پہلی مرتبہ ملکی سیاست کے میدان میں کچھ ہلچل پیدا ہوئی۔ اور محترمہ فاطمہ جناح کی ہمت و جرأت نے دیمک کی طرح مارشل لاء کے عصائے سلیمانی کو چاٹ کر لیا۔ تب سیاسی سورماؤں کو ہوش آیا۔ اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ لیکن اب وقت کم تھا اور صدر ایوب کی سیاسی حکمت عملی نے انتخابات کو ملتوی کرنے سے انکار کر کے 'احزابِ مخالف' کے ہاتھوں سے موقع چھین لیا!

اس موقع پر مخالف احزاب نے " C O P " کے نام سے جو متحدہ محاذ قائم کیا تھا اس کے پاس عوام کو اپیل کرنے کے لئے تو آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کے قیام کا بھاری بھرکم نعرہ تھا۔ لیکن تجزیے سے جو بات سامنے آتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ صدارتی طرزِ حکومت کے بجائے پارلیمانی طرز کا احیاء مطلوب تھا اور بس۔ اس مطالبے اور اس کے لئے متحدہ محاذوں کے قیام کے بارے میں ہماری پختہ رائے وہی ہے جو ہم نے مئی سنہ ۶۹ء کے متذکرہ بالا تذکرہ و تبصرہ میں عرض کی تھی یعنی یہ کہ :-

"سا تھ ہی یہ موٹی سی بات بھی ہر مخلص پاکستانی کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اس کا علاج نہ صدارتی اور پارلیمانی جمہوریت یا بلاواسطہ و بالواسطہ انتخابات کے مسئلوں پر وقتی ہنگامے اٹھانے سے ہو سکتا ہے نہ چیونٹیوں کی پنسیری کی طرح کے بالکل انمل بے جوڑ متحدہ محاذوں کے قیام سے ——! اس صورت حال کی اصلاح کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ بالکل فطری طریق پر عوام میں سے کوئی سیاسی جماعت ایسی اٹھے جو مسلسل محنت و مشقت اور پیہم جد و جہد کے ذریعے ایک طرف ان میں سیاسی شعور اور اپنے بھلے اور برے کی حقیقی پہچان پیدا کرے اور دوسری طرف ایک بڑی تعداد میں ایسے قومی کارکنوں کو تربیت دے کر تیار کرے جو ہر طرح کے مفادات سے صرفِ نظر کر کے خالص اصولوں کے لئے کام کر سکیں اور اپنے مقصد اور نصب العین کے ساتھ مخلصانہ تعلق اور قوم کی بہتری اور بھلائی کے لئے انتھک محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کی صلاحیت رکھتے ہوں ——!"

سنہ ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے بعد کے چار سالوں کے بعض حالات و واقعات کا تذکرہ ملک کی موجودہ سیاسی صورتِ حال کے صحیح تجزیے اور ان مختلف عوامل کے صحیح فہم کے لئے ناگزیر ہے جو اس وقت ملک کی سیاسی فضا میں بر سرِ کار ہیں۔

۱: سنہ ۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے دوران جو زلزلہ سا صدر ایوب کے ایوانِ اقتدار میں محترمہ فاطمہ جناح کی شرکت کے باعث آگیا تھا، اس سے خبردار ہو کر صدر ایوب نے اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے اور اس غرض کے لئے اپنی جماعت کو مضبوط بنیادوں پر از سرِ نو منظم کرنے کی جانب توجہ کی اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے لئے انہوں نے سر توڑ کوشش کی۔ چنانچہ ابتدائی زمانے میں جبکہ احزابِ اختلاف کچھ تو اپنی انتخابی شکست کے زخم

چاٹنے میں مصروف تھیں اور کچھ باہم دست و گریباں بھی ہو گئی تھیں۔ کنونشن لیگ کی تنظیم نو کا خاصہ چرچا ہوا اور کچھ عرصے تک تو یہ محسوس کیا گیا کہ شاید آئندہ اس ملک کی واحد سیاسی تنظیم سرکاری لیگ ہی ہو گی ـــــ لیکن جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ نہ تو صدر ایوب عوام میں کوئی "جذبہ تازہ" پیدا کر سکے اور نہ ہی مخلص اور محنتی کارکنوں کی کوئی ٹیم تیار کر سکے ـــــ چنانچہ ادھر کچھ عرصے سے صدر ایوب کے قریبی حلقے کے لوگ بھی برملا اعتراف کر رہے ہیں اور غالباً حالیہ سیاسی ہنگاموں کے بعد تو صدر ایوب خود بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ وہ پاکستان مسلم لیگ کو ایک منظم اور فعال جماعت بنانے کی کوشش میں قطعاً ناکام ہو گئے ہیں اور اس کوشش میں جو وقت اور سرمایہ صرف ہوا وہ اکثر و بیشتر ضائع ہو گیا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں کسی عوامی جدّوجہد کے دوران محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کے ذریعے منظم و مستحکم ہوا کرتی ہیں اور مصائب و تکالیف کے الاؤ اور ابتلاؤں اور آزمائشوں کی بھٹیوں سے گذر کر ہی ان کے کارکنوں کا مسِ خام کندن بنتا ہے، مسندِ اقتدار تک رسائی کے بعد سے تو فوری طور پر کسی سیاسی جماعت کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ حکومت کے ایوانوں اور اقتدار کی مسندوں پر بیٹھ کر سیاسی جماعتوں کی تنظیم کی کوشش ویسا ہی احمقانہ خیال ہے جیسا یہ منصوبہ کہ پہلے سیدھے یا ٹیڑھے جس راستے سے بھی ممکن ہو اقتدار پر قبضہ جما لیا جائے اور پھر اس کے ذریعے ایک عوامی اسلامی انقلاب برپا کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ کنونشن لیگ سے منسلک لوگوں میں سے اکثر و بیشتر کی اصل نظر مفادات پر ہے اور ان ہی کی باہمی بندر بانٹ پاکستان مسلم لیگ کی اصل اجتماعی سرگرمی ہے نہ اس کے پاس مخلص کارکن ہیں اور نہ ہی عوام کی پشت پناہی اسے حاصل ہے ـــــ نتیجۃً صدر ایوب کی حکومت یا تو خود ان کی اپنی ذات کے بل پر قائم ہے یا سروسز کے سہارے، اس کی کوئی حقیقی اور واقعی سیاسی اساس موجود نہیں ہے۔

۲: ۱۹۶۵ء کی پاک ہند جنگ بلاشبہ گذشتہ صدارتی انتخابات کے بعد کے دور کا اہم ترین واقعہ ہے۔ ملک کے بقا و دفاع اور خاص طور پر اس کی خارجہ حکمت عملی کے اعتبار سے تو اس کی اہمیت اظہر من الشمس ہے ہی، ملک کی داخلی سیاست پر بھی اس کے بہت گہرے اثرات مترتب ہوئے۔ ہمیں یہاں اس سترہ روزہ جنگ کے اسباب وعلل سے تو سرے سے کوئی بحث ہی نہیں، اس کے تمام عواقب و نتائج کا استقصاء بھی مطلوب نہیں البتہ ان میں سے چند ایسے امور کا تذکرہ ناگزیر ہے جن کا براہ راست تعلق ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال سے ہے۔

ان میں سے اہم ترین امر تو یہ ہے کہ اس جنگ کے جو نتائج برآمد ہوئے ان کی بنا پر صدر ایوب کی سیاسی حیثیت کو شدید دھکا لگا اور ان کا جو ستارہ ایشیا کے ایک عظیم رہنما بلکہ دیگر ایشیائی ڈیگال کی حیثیت میں عروج کی جانب حرکت کر رہا تھا، یکایک بے زوال ہو گیا۔

● دوسرے یہ کہ پاکستان کی خارجہ حکمت عملی جو چند سال قبل سے مسلسل ایک خاص رخ پر بڑھتی چلی جا رہی تھی ایک انتہا پر پہنچ کر نہ صرف یہ کہ رک گئی بلکہ واپس قدیم سمت میں گردش کرنے لگی ـــــ اور یہ ظاہر احوال بھی اس میں کم از کم اعتدال کا عنصر نمایاں ہو گیا۔

● تیسرے یہ کہ مسلم قومیت کا جو جذبہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کا سبب بنا تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد جلد ہی سرد پڑ گیا تھا۔ اس جنگ کے دوران نہ صرف یہ کہ ایک دم پھر بیدار ہوا بلکہ ایک بار پھر اپنے پورے عروج کو پہنچ گیا۔ اگرچہ اس کا یہ زور شور (TEMPO) اب کی بار بھی عارضی ہی ثابت ہوا اور جنگ کے بعد جلد ہی یہ جذبہ پھر سرد پڑنا شروع ہو گیا۔

پاکستان کی خارجہ حکمت عملی اور پاکستانی قومیت دونوں کے اعتبار سے پاکستان کی سیاسیات میں جو مدّ اس جنگ کے دوران آیا تھا صدر ایوب کو تو اپنی مخصوص ذہنی دارانہ حیثیت کی مجبوریوں کی بنا پر اسے ایک خاص حد تک لے جانے کے بعد واپس جذر کی جانب لوٹنا پڑا ـــــ لیکن ان کے اپنے ایک تربیت دادہ نوجوان ساتھی نے مدّ سے جذر کی جانب رجوع سے انکار کر دیا اور وہ اسی مقام پر کھڑا رہ گیا۔ نتیجۃً اس نے اس مدّ کے لئے علامتی حیثیت اختیار کر لی ـــــ بس یہیں سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی اصل ذاتی سیاسی زندگی اور پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایک بالکل نئے باب کا آغاز ہو گیا!!

۳: قدیم سکہ بند احزاب اختلاف، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ۱۹۶۷ء کے صدارتی انتخابات کے بعد کچھ عرصہ تو کچھ اپنی انتخابی شکست کے زخموں کو سہلانے میں مصروف رہیں اور کچھ باہمی اختلافات میں الجھی رہیں اس کے فوراً بعد ۱۹۶۵ء کی پاک ہند جنگ واقع ہو گئی جس میں پوری قوم متحد اور یکسو تھی اور اختلاف و افتراق کی گنجائش ہی نہ تھی۔ جنگ کے فوراً بعد اعلان تاشقند سے انہیں صدر ایوب کی حکومت کے خلاف عوامی جذبات کو مشتعل کرنے کا ایک سنہری موقع ہاتھ آیا تھا اور مخالف جماعتوں کے جوشیلے کارکن اس پر مصر بھی تھے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن بعض بزرگ سیاست دانوں نے عوامی ایجی ٹیشن کی تجویز کو رد کر کے ایک پُر امن آئینی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، نظام اسلام پارٹی، عوامی لیگ اور مشرقی پاکستان کے قومی جمہوری محاذ پر مشتمل ایک متحدہ محاذ پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ (PDM) کے نام سے معرض وجود میں آگیا جو تقریباً دو سال سے سہل انداز میں اور سبھ چال سے لیکن بڑے تسلسل و استقلال کے ساتھ دھیمے دھیمے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک مسٹر بھٹو نے ہنگامہ کھڑا کر کے اسے بالکل نئی صورت حال سے دوچار کر دیا۔

پی ڈی ایم کو اس بات کا کریڈٹ بہرحال دیا جانا چاہیئے کہ اس نے تقریباً دو سال تک بحالی جمہوریت کے لئے بڑی مستقل مزاجی سے کام کیا ہے اور اس کے لئے واقعی اور حقیقی محنت کی ہے۔ اور اگرچہ وہ جس شائستہ اور بے ضرر قسم کے طریق کار کی عادی ہے۔ اس سے کسی بھی حکومت کو فوری طور پر خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ایک ملک کی اپنی نوکر شاہی (BEAUROCRACY) کی حکومت کو جو ایک حقیقی

عوامی جمہوری حکومت کے سوائے باقی تمام قسم کی حکومتوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے —— تاہم اس میں شک نہیں کہ کم ازکم پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پی ڈی ایم کی حالیہ دو سالہ جدوجہد ایسی منظم اور مسلسل اور آئینی و پرامن جدوجہد کی کوئی دوسری مثال جماعت اسلامی کی ابتدائی دستوری مہموں کے سوا نہیں ملتی اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ P D M کا اصل تنظیمی ڈھانچہ بھی جماعت اسلامی ہی کے سہارے قائم ہے اور اس کی اصل روح رواں بھی جماعت اسلامی ہی ہے۔ پی ڈی ایم میں شامل دوسری تمام جماعتیں اور پارٹیاں چند معروف سیاست دانوں کی باہمی ایسوسی ایشنوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں وہ اصل جماعتی تنظیم جس کے بل پر پی ڈی ایم کا سارا کاروبار چل رہا ہے صرف جماعت اسلامی کی ہے۔

پی ڈی ایم کے بارے میں ایک اور اہم بات جو پیش نظر رہنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اس پہ دائیں بازو کے رجحانات کا فیصلہ کن غلبہ ہے۔ بائیں رجحانات کے حامل صرف نہایت نرم طبع اور معتدل مزاج لوگ ہی اس میں کھپ سکے ہیں اور انہیں بھی جلد یا بدیر اس سے علیحدگی اختیار کرنی ہو گی —— یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس اعتبار سے بھی اصل علامتی حیثیت اس گروہ میں جماعت اسلامی ہی کو حاصل ہے اور یہ جیسا کہ ہم بعد میں قدرے تفصیل سے عرض کریں گے۔ اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے ایک بہت بڑی بدقسمتی کا آغاز ہے۔

: سوشلسٹ ذہن اور بائیں بازو کے رجحانات مشرقی پاکستان کی حد تک تو کم ازکم اتنے ہی 'قدیم' ہیں جتنا خود پاکستان، لیکن مغربی پاکستان میں یہ رجحانات زیادہ تر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ابھرے ہیں۔ اور گذشتہ دو ڈھائی سال کے عرصے میں، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رجحانات تیزی کے ساتھ پھیلے بھی ہیں اور مختلف تنظیمی ہیئتوں کی شکل میں نمودار بھی ہوئے ہیں۔ اس کا ایک سبب ملک کی معیشت میں 'صنعتی انقلاب' کے اثرات بھی ہیں جن سے موجودہ استحصالی نظام معیشت کی گھناؤنی صورت کھل کر سامنے آ رہی ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بیکاری سے بھی ان رجحانات کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ہماری گذشتہ پانچ چھ سال کی خارجہ پالیسی نے بھی جس کے مد و جزر کی جانب ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں ان رجحانات کو تقویت دی ہے —— غرض کہ مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر ہمارے ملک میں سوشلسٹ نظریات اور بائیں بازو کے رجحانات نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی قوت کی صورت اختیار کر لی ہے۔

مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی اس کی ایک عظیم علامت ہیں اور مغربی پاکستان میں یوں تو اس کے کئی ایک دھڑے ہیں، لیکن ان کے اصل علامت کی حیثیت بلاشبہ مسٹر بھٹو کو حاصل ہو گئی ہے۔ اور اگرچہ ان دونوں کے مابین اشتراک عمل کی کوئی واضح صورت تا حال سامنے نہیں آئی تاہم یہ ایک یقینی امر ہے کہ عنقریب ان دونوں میں اتحاد کی صورت پیدا ہو جائے گی اور پھر یہ بائیں بازو کا وہ اصل مرکز (NUCLEUS)

ہوگا جس کے گرد ملک کے تمام سوشلسٹ عناصر حتیٰ کہ معتدل مزاج (یا عام اخباری اصطلاح کے مطابق ماسکو نواز) طبقے بھی جو اس وقت پی ڈی ایم کے ساتھ ہیں جلد یا بدیر جمع ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

۵۔ گذشتہ دو ڈھائی سال کے دوران تدریجاً ایک اور قوت بھی پاکستانی سیاست کے منظر عام پر نمودار ہوئی ہے ہماری مراد جمعیت علمائے اسلام سے ہے جس نے اس عرصے میں رفتہ رفتہ خاصی قوت بہم پہنچائی ہے اور اپنے منتشر اثرات کو خاصے مضبوط تنظیمی سلسلے میں منسلک کر لیا ہے۔ یہ تنظیم اگرچہ اپنی ہیئت اور نوعیت کے اعتبار سے دوسری تنظیموں مثلاً جماعت اسلامی سے بہت مختلف انداز کی ہے (مثلاً اس کے یہاں کا غذی کارروائی اور دفتری نظام شاید بالکل ہی دقیانوسی اور PRIMITIVE طرز کا ہو) لیکن ایک مشترک ذہنی ساخت اور مشترک انداز فکر اور اس کے ساتھ ساتھ ایک شاندار ماضی کے ورثے کی بنا پر اس گروہ نے بہت جلد ایک نہایت منظم اور فعال خطری تنظیم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ عوام میں اس کی جڑیں انتہائی زیریں سطحوں (SUBSTRATA) تک گہری اتری ہوئی ہیں۔ دینی مدارس اس کے مستقل مراکز اور اللہ کے گھر اس کے مستقل دفاتر ہیں۔ اس کے عام کارکن ہی نہیں اکابر تک سب خالص عوامی کارکن ہیں، سادگی، دینداری اور غایت درجہ خلوص کے ساتھ نہایت زوردار جذبۂ عمل اس کے شعار ہیں۔ ان تمام چیزوں کے پیش نظر یہ اندازہ قطعاً مبالغہ پر مبنی نہیں ہے کہ آئندہ پاکستان کی سیاست کے میدان میں جمعیت علمائے اسلام نہایت مؤثر رول ادا کرے گی۔

ہم اپنی صفحات میں چند ماہ قبل یہ عرض کر چکے ہیں کہ یہ گروہ ذہناً و قلباً خالص حسینی[1] ہے۔ یعنی علمائے دیوبند کے اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس کے سرگروہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح تھے۔ اس طرح ان کا تعلق تحریک آزادی ہند و استخلاص وطن کے اس قدیم و عظیم سلسلے سے جا ملتا ہے جو تحریک شہیدینؒ سے شروع ہو کر ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی سے ہوتا ہوا اور پھر تحریک خلافت اور ریشمی رومالوں کی تحریک ایسی دوسری متعدد چھوٹی چھوٹی کڑیوں سے گزر کر بالآخر جمعیت علمائے ہند پر منتج ہوا تھا۔ اور اس پورے عرصے میں اسلامیان ہند کی رہنمائی کا فرض ادا کرتا رہا تھا۔ آزادی ہند سے متصلاً قبل مسلمانان ہند کی ایک عظیم اکثریت نے اس گروہ کے راستے کو چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا تھا جو بالآخر قیام پاکستان پر منتج ہوا[2]۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اوّل اوّل اس طبقے پر شکست کا سا احساس طاری رہا۔ اور ان حضرات نے ایک عرصے تک حلقۂ دیوبند کے ان دوسرے اکابر کی سیادت قبول کر کے جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تھا گوشۂ عافیت میں پناہ لئے رکھی۔ ۵۲/۵۳ء میں مجلس احرار اسلام نے جو عظیم سیاسی ایجی ٹیشن برپا کیا تھا اس کی پشت پر اصل قوت اسی گروہ کی تھی۔ اس کے فوراً بعد جب پاکستانی سیاست میں انتشار برپا ہوا اور مسلم لیگ کو مفید کن سیاسی حیثیت حاصل نہ رہی تو اس گروہ نے بھی اپنی حامی مسلم لیگ قیادت کا جوا گردن سے اتار پھینکا اور خالصتہً اپنا اصل اور قدیم رنگ اختیار کر لیا۔

---

[1] اس اہم موضوع پر ہم مفصل اظہار خیال مارچ ۱۹۶۷ء کے تذکرہ و تبصرہ میں کر چکے ہیں۔

—— اس وقت سے اب تک اندر ہی اندر ان کی تنظیم وسعت اختیار کرتی رہی اور اس کے کارکنوں میں جوش وجذبہ بیدار ہوتا رہا —— گذشتہ سال ان کی جو کانفرنس لاہور میں موچی دروازے کے باہر ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ جلد ہی جمعیت پاکستان کی عملی سیاست میں مؤثر طور پر دخیل ہو گی —— اور واقعہ بھی یہی ہے کہ مارشل لاء کے بعد سے جو سکوت وسکون پاکستانی سیاست پر طاری تھا اور لوگ جس طرح سہمے سہمے سے تھے اس میں پہلی ہلچل اور اوّلین سیاسی سرگرمی جمعیت ہی کے زیراثر پیدا ہوئی‘ ہماری مراد اس کامیاب ایجی ٹیشن سے ہے جو ڈاکٹر فضل الرحمان کی کتاب کے خلاف برپا ہوئی تھی اور جس سے چھٹکارا پانے کے لیے حکومت وقت کو ڈاکٹر صاحب موصوف کو قربانی کا بکرا بنانا پڑا تھا!

> اس گروہ کے بارے میں اہم ترین بات جو نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہے اور چاہے اس کا سبب مغربی استعمار سے شدید نفرت کا وہ قدیم جذبہ ہو جو انہیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملا ہے اور گویا ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے‘ چاہے یہ واقعہ ہو کہ چونکہ یہ خود ایک خالص عوامی قوت ہیں لہذا عوام کی دقتوں اور مشکلات کا زیادہ قریبی احساس رکھتے ہیں‘ اور چاہے یہ ہو کہ ماضی میں ان کا اشتراک عمل جس عظیم سیاسی تحریک کے ساتھ رہا ہے (ہماری مراد ماضی کی انڈین نیشنل کانگرس سے ہے!) اس پر بالعموم سوشلسٹ خیالات کا غلبہ تھا —— سبب یا اسباب خواہ کچھ بھی ہوں بہرحال واقعہ یہی ہے کہ جمعیت علمائے اسلام کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہے۔ اور چاہے اس کے اکابر و رہنما خالص اور بے آمیزش اسلام ہی کے علمبردار ہوں۔ اس کے کارکنوں میں کثیر تعداد ایسے جوشیلے لوگوں کی شامل ہے جو اسلام کے ساتھ سوشلزم کا پیوند فطری طور پر درست اور بحالات موجودہ عملاً لازمی خیال کرتے ہیں —— !

یہی وجہ ہے کہ مشرق اوسط کی سیاست میں بھی یہ حضرات صدر ناصر کے حامی و موید اور شاہ فیصل کے ناقد و مخالف ہیں —— اور تازہ سیاسی ہنگامے میں بھی ان کی شرکت اوّلاً نیشنل عوامی پارٹی اور بھٹو صاحب کی پاکستان پیپلز پارٹی کے شانہ بشانہ ہوئی ہے۔ اس صورت حال کا صحیح اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگلستان سے واپسی پر جب مولانا مودودی نے غیر معمولی گھن گرج کے ساتھ سوشلزم کے حامیوں کو چیلنج کیا تو اس کے جواب میں جمعیت علمائے اسلام کے سرکاری آرگن ’ترجمان اسلام‘ نے ”مودودی صاحب کی تازہ گھن گرج“ کے عنوان سے تحریر فرمایا کہ:۔

> ”لندن کی سرد آب و ہوا سے صحت یاب ہو کر مودودی صاحب پاکستان کے نسبتاً گرم ماحول میں تشریف لا چکے ہیں جس کی گرمی میں کافی اضافہ ان کی غیر حاضری کے دوران کے پیدا شدہ گرم سیاسی موسم نے کر رکھا ہے آپ نے ۱۰ دسمبر کی شام کو لاہور میں مختلف حصوں سے آئے ہوئے اپنی جماعت کے کارکنوں سے زبردست گھن گرج کے عالم میں فرمایا کہ ”جب تک ہم زندہ ہیں اس وقت تک کسی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ یہاں اسلام کے سوا کسی اور نظام کو لا سکے“۔ مودودی صاحب کی یہ گھن گرج اگر اس دعویٰ کی حقیقتاً حامل ہوتی اور اپنے ان فرمودات کے دوسرے حصوں میں خود ہی انہوں نے اپنی اس ’گھن گرج‘ کی بامعنی تردید نہ فرما دی ہوتی تو اس اعلان کا خیر مقدم پاکستان کا ہر دین دار مسلمان دل سے کرتا۔ لیکن اسے

> کیا سمجھے کہ اس ساری "گھن گرج" کا مقصد صرف یہاں پہنچ کر ختم کر دیا گیا کہ "اسلام اور سوشلزم کا پیوند لگانا ممکن نہیں" اور یہ کہ "یہ محمد عربی ؐ کی اُمّت کا ملک ہے، یہ مارکس یا ماؤزے تنگ کی اُمّت کا ملک نہیں ہے"۔ —— سوال یہ ہے کہ اسلام اور سوشلزم کے پیوند کا انکار کرنے والا اسلام اور برطانوی پارلیمانی نظام کے پیوند کا بھی انکار کیوں نہیں کرتا؟ اور محمد عربی ؐ کی اُمّت کے اس ملک کے مارکس اور ماؤزے تنگ کی امت کا ملک ہونے کی نفی کرنے والا اس ملک میں اس برطانوی سیاسی نظام کی بحالی کی جدو جہد میں کیوں مصروف ہے؟ جو گلیڈسٹون، لائڈ جارج، چرچل وغیرہ کا تراشیدہ اور رائج کردہ ہے؟ آخر اسلامی نظام کے قیام کی یہ بلند بانگ صدا صرف سوشلزم کے ہی مقابلہ میں کیوں اتنی "گھن گرج" دکھاتی ہے اور کیوں برطانوی پارلیمانی نظام کی حمایت میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس نظام کے ہر چھوٹے بڑے جزو کو بھی قبول کرتی چلی جاتی ہے۔" (ترجمان اسلام ۱۰ جنوری ۶۹ء)

الغرض ایک طویل مدت کے حبس کے بعد جو طوفانی کیفیت گذشتہ ڈھائی تین ماہ کے دوران پاکستانی سیاست کے میدان پر طاری رہی تھی اس کے مدھم پڑتے ہی جو نئی صورت حال سامنے آئی ہے اور گذشتہ چند سالوں سے جو رجحانات زیر سطح تقویت پاتے رہے ہیں ان کے ایک دم سطح پر آجانے سے سیاست کی جو تازہ بساط پاکستان میں بچھی ہے اس کا مختصر نقشہ یہ ہے :-

۱ : جہاں تک حکومت وقت کا تعلق ہے وہ کچھ ایک فرد کی ذاتی شخصیت کے سہارے اور زیادہ تر نوکر شاہی کے بل پر قائم ہے اس کی عوامی و سیاسی جڑیں اوّل تو کوئی ہیں ہی نہیں اور جو ہیں ان کی حیثیت بھی زیادہ سے زیادہ ان اضافی جڑوں (ADVENTITIOUS ROOTS) کی سی ہے جو بعض درختوں (مثلاً برگد) کی شاخوں سے اتر کر زمین میں پیوست ہو جاتی ہیں اور درخت کے پھیلاؤ کے لئے اضافی سہاروں کا کام دیتی ہیں۔

۲ : پاکستانی سیاست کا وہ دور اب گذر چکا جب سیاست صرف اصحاب دولت و ثروت کے مشغلے کی حیثیت رکھتی تھی اور گنتی کے چند جاگیردار اور سرمایہ دار (جن میں تازہ اضافہ بعض نو دولتیے صنعت کاروں کا ہوا تھا) اس پر کامل اجارہ داری رکھتے تھے۔ اب یہاں عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو گیا ہے اور وہ دور قریب آیا چاہتا ہے جس کی خبر علامہ اقبال مرحوم نے اپنے ان اشعار میں دی تھی کہ ؎

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اور ؎ گیا دور سرمایہ داری گیا تماشہ دکھا کر مداری گیا

۳ : پاکستان کی موجودہ بساطِ سیاست کے عناصر اربعہ حسب ذیل ہیں۔ ایک دائیں بازو کے قدیم خاندانی اور پیشہ ور سیاست دان جو اکثر و بیشتر زمینداروں اور سرمایہ داروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اگرچہ اس وقت متعدد سرکاری و غیر سرکاری لیگوں میں منقسم ہیں لیکن درحقیقت 'ملّت واحدہ' ہیں اور کسی بھی وقت "آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک" کے مصداق باہم متحد ہو سکتے ہیں —— دوسرے دائیں بازو کی مضبوط مذہبی جماعت —— جماعت اسلامی۔ —— تیسرے بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں جن میں سے کچھ فی الوقت پی ڈی ایم (یا تازہ تر ڈی اے سی) میں شامل ہیں اور کچھ اس کے باہر ہیں اور —— چوتھے

دائیں بازو کی مذہبی جماعت ـــــ جمعیت علمائے اسلام

نوٹ: پاکستان کی آئندہ سیاسیات کا اصل محور (A X I S) دائیں اور بائیں بازوؤں کے رجحانات کا تصادم ہوگا اور متذکرہ بالا موجودہ لبرل سیاست میں جو گروہ بندیاں اس محور کے علاوہ کسی اور بنیاد پر قائم ہیں یا ابھی قائم ہو رہی ہیں وہ جلد یا بدیر ٹوٹ کر رہیں گی اور نئی صف بندی (ALIGNMENT) اسی محور کے گرد ہوگی۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ قابل حذر، لیکن قطعاً یقینی امر یہ ہے کہ دائیں اور بائیں بازو کی بیرونی قوتیں بھی اب پاکستانی سیاست میں پہلے سے کہیں زیادہ دخیل ہوں گی اور اپنے اپنے مفادات کے تحفظ اور اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کے دفاع اور ان میں توسیع کے لئے زیادہ سے زیادہ اعلانی حد تک اثر انداز ہونے کی کوشش کریں گی۔

لہ جس کی ایک ناخوشگوار ابتداء لاہور اور کراچی میں دائیں بازو کی انتہائی جماعت یعنی جماعت اسلامی اور بائیں بازو کے انتہا پسند لوگ یعنی پی پی پی کے کارکنوں کے سر پھٹول کی شکل میں ہو چکی ہے۔

عوامی لیگی ٹلیشن سے دوسرے مارشل لا کے نفاذ تک

بعض اہم حوادث و واقعات

(۱)

ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق فروری ۱۹۶۹ء

مظاہروں اور ہنگاموں کا دوسرا دور

گذشتہ ماہ کا "تذکرہ و تبصرہ" ہم نے اس نسبتاً پر سکون وقفے کے دوران تحریر کیا تھا جو پاکستانی سیاست کے میدان میں پہلی طوفانی بلچل کے بعد کچھ دنوں کے لئے آیا تھا اور اگرچہ ہم نے اس وقت کی سکون آمیز کیفیت کے بارے میں اس خدشے کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ "عین ممکن ہے کہ یہ سکوت و سکون کسی دوسرے طوفان کا پیش خیمہ ہی ثابت ہو"! تاہم واقعہ یہ ہے کہ ہمیں قطعاً اندازہ نہ تھا کہ اس قدر فوری طور پر ایک دوسرا طوفان آ جائے گا جس کی تیزی و تندی سابقہ تمام ریکارڈ توڑ ڈالے گی!

بہرحال متوقع یا غیر متوقع، طوفان کا یہ دوسرا ریلا تھا بہت سخت، جس میں معاطہ جلسوں، جلوسوں، مظاہروں، لاٹھی چارج اور اشک آور گیس کے استعمال سے بہت آگے نکل کر عوام کی طرف سے توڑ پھوڑ لوٹ مار آتشزنی و خشت باری بلکہ بعض مقامات پر مہلک ہتھیاروں کے استعمال تک ـــــ اور حکومت کی جانب

سے پولیس کی فائرنگ، فوج کی طلبی اور کرفیو کے نفاذ تک پہنچا۔ چنانچہ مشرقی و مغربی پاکستان کے درجن بھر بڑے بڑے شہروں میں مسلسل کئی روز تک لاقانونیت کا دور دورہ رہا اور شہری زندگی پر کامل تعطل کی کیفیت طاری رہی —— اور اگرچہ ان سطور کی تحریر کے وقت صورت حال یہ ہے کہ بالعموم حالات پر قابو پایا جا چکا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ فوج کی آمد اور کرفیو کے نفاذ کے بعد کسی جگہ سے بھی کسی خاص واقعے یا حادثے کی اطلاع نہیں ملی۔ چنانچہ اکثر مقامات سے کرفیو اٹھایا بھی جا چکا ہے تاہم حالات کسی طرح بھی اطمینان بخش قرار نہیں دیئے جا سکتے اور عین ممکن ہے کہ کچھ وقفے کے بعد دوبارہ ناخوشگوار واقعات کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

لاقانونیت اور انارکی | یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاست سخت تشویش ناک صورت اختیار کر گئی ہے اور ملک و ملت کے تمام بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ جماعتی سیاست کے تقاضوں سے بلند تر ہو کر خالص ملی و قومی سطح پر غور و فکر کریں اور اس پیچیدہ صورت حال کو جلد از جلد سلجھانے کی کوشش کریں۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ سیاسی ایجی ٹیشن کے اس دوسرے ریلے میں لاقانونیت اور انارکی کا رنگ غالب تھا اور اگرچہ تمام مخالف جماعتوں نے تخریبی سرگرمیوں کی ذمہ داری سے اظہار برأت کیا ہے اور توڑ پھوڑ اور لوٹ مار کی ساری ذمہ داری کسی قدر غنڈہ عناصر پر اور زیادہ تر خود حکام کے غلط اقدامات پر ڈالی ہے اور یہ الزام بھی لگایا ہے کہ یہ ساری کارروائی حکام نے سخت تر اقدامات کا جواز مہیا کرنے کے لئے از خود اپنے ایجنٹوں سے کرائی ہے تاہم یہ بالکل واضح ہے کہ عوامی سطح پر سیاسی شعور اور جماعتی تنظیم کی ابھی ہمارے یہاں بہت کمی ہے اور اپوزیشن کسی طرح بھی اس امر کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ قوم کی ایک ایسی واضح اکثریت کا اعتماد و تعاون اسے حاصل ہے کہ وہ اپنی سیاسی تحریک کو طے کردہ خطوط پر چلانے اور اسے کوئی غلط رخ اختیار کرنے سے روکنے پر قادر ہے۔

آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے ایک مرتبہ اپنی سیاسی تحریک کو عین عروج کے موقع پر محض اس بنا پر ایک دم بند کر دیا تھا کہ ایک مشتعل ہجوم نے ایک تھانے پر حملہ کر دیا تھا اور اس کے باوجود کہ ان کے تمام اہم رفقاء اس پر سخت برہم ہوئے تھے اور مُصر تھے کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے لیں وہ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے تھے اور گویا ان کا موقف یہ تھا کہ ایسے واقعات کا ظہور ہماری سیاسی پوزیشن کی کمزوری اور عوام پر ہماری گرفت کی کمی کا ثبوت ہے اور ہمیں ابھی ؎

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

کے مصداق عوامی تحریک چلانے سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی توجہات عوام کے سیاسی شعور کی تربیت اور عوامی تنظیم کے استحکام پر مرکوز کرنی چاہئیں۔

ہمارے یہاں، جیسا کہ ہم نے گذشتہ ماہ بھی عرض کیا تھا اس وقت عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ بالکل شروع ہی سے سیاست کے میدان میں صحت مند روایات قائم ہوتی چلی جائیں اور مختلف الخیال عناصر اپنی اصل توجہ رائے عامہ کو بیدار کرنے اور اپنی جماعتی تنظیم کو مستحکم کرنے پر صرف کریں۔ جتھا بازی اور ہنگامہ آرائی میں کسی کی بھی خیر نہیں ہے اور تخریبی سرگرمیوں سے موجودہ حکومت ہی کو پریشانی نہیں ہوگی بلکہ اگر یہ عادت پختہ ہوگئی تو آئندہ بھی ہر حکومت کو مسلسل دقت کا سامنا رہے گا۔ ہمارا سیاسی شعور ابھی بہت کچھ پختگی کا محتاج ہے اور اس نیم خام و نیم پختہ حالت میں اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ تمام محب وطن اور محب قوم عناصر پوری طرح ہوشیار رہیں۔ مبادا ملک و ملت کے دشمن انارکی کے پردے میں قوم و وطن کو کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں۔

طلبہ کا مسئلہ

خاص طور پر طلبہ کا مسئلہ اس وقت نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر گیا ہے۔ ان میں عام بے چینی اور اضطراب کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کے بہت سے اسباب ہیں اور یہ مسئلہ صرف ہمارے ملک کا ہی نہیں پوری دنیا کا ہے۔ تہذیب جدید نے انسان کو روحانی قدروں سے جس طرح بے گانہ کیا ہے اور اخلاقی معیارات جتنی تیزی سے پست ہوتے ہیں اس کا مظہر اتم بہرحال نوجوان نسل ہی کو ہونا چاہیئے اور کسی اعلیٰ نصب العین کے فقدان کے باعث جو مہیب خلا انسانی زندگی میں پیدا ہو گیا ہے اس کا سب سے نمایاں اثر بھی نوجوان طلبہ ہی میں نظر آنا چاہیئے۔ ان پیچ در پیچ اسباب کی بنا پر پوری دنیا میں نوجوان طلبہ کے طبقے کی کیفیت بالکل بارود کی سی ہے جو ذرا سی چنگاری سے بھڑک اٹھنے کو تیار ہوتا ہے۔ پھر خاص طور پر زیر ترقی ممالک کے اپنے مخصوص مسائل ہیں جن سے طلبہ کی بے چینی میں مزید اضافہ ہوتا ہے ——— چنانچہ ہمارے یہاں بھی یہ طبقہ ع " دیوانہ را ہوئے بس است! " کے مصداق گویا منتظر ہی تھا کہ کہیں سے کوئی صورت ایجی ٹیشن کی پیدا ہو اور یہ اس میں کود پڑیں۔

گذشتہ چند سالوں کے دوران ہماری حکومت نے طلبہ کی سیاسی سرگرمیوں پر جو پابندیاں عائد کئے رکھی ہیں ان سے بھی ان کے اندر ہی اندر ایک لاوا سا پکتا رہا ہے جسے بہرحال ایک نہ ایک دن پھٹنا تھا چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ حالیہ سیاسی ایجی ٹیشن میں اصل زور شور طلبہ ہی کا پیدا کردہ ہے اور موجودہ سیاسی ہماہمی ان ہی کی رہین منت ہے۔ تین ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا کہ یونیورسٹیاں اور کالج بند ہیں اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ قطعاً معطل پڑا ہے۔ اور اب بھی اگرچہ کچھ کالج کھل گئے ہیں بہت سے طالب علم کلاسوں کا بائیکاٹ کر رہے ہیں اور اس کے باوجود کہ ان کے کچھ مطالبات تسلیم بھی کئے جا چکے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حکومت نے گویا ان کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں لیکن ان کا ایجی ٹیشن علیٰ حالہٖ قائم ہے اور نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی کمی نہیں آ رہی بلکہ ان کے مطالبات میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے ——— حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کے طلبہ نے تو اپنے مطالبات میں تمام سیاسی طبقات کے جملہ مطالبات کو شامل کر لیا ہے۔

یہ صورتِ حال یہی متقاضی ہے کہ ملک و ملت کے بہی خواہ اس پر اپنے اپنے جماعتی و گروہی نقطۂ ہائے نظر سے نہیں بلکہ قومی و ملی نقطۂ نظر سے سوچیں۔ جو سیاسی حلقے طلبہ کو اپنے پیش نظر سیاسی انقلاب کے لئے استعمال کرنے کی کوشش میں ہیں وہ درحقیقت آگ سے کھیل رہے ہیں اور انہیں کسی طرح قوم اور وطن کا بہی خواہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سیاست اصلاً ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو تعلیم سے فارغ ہو کر ملک کے ذمہ دار شہریوں کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ طلبہ کا اصل کام یہ ہے کہ اپنے زمانۂ تعلیم میں آئندہ زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی زیادہ سے زیادہ استعداد پیدا کریں۔ اسی تعلیم و تربیت کا ایک جزو یقیناً سیاسی شعور اور ملکی و قومی مسائل کی سوجھ بوجھ بھی ہے۔ لیکن دورانِ تعلیم کسی سیاسی دھڑے کا آلۂ کار بننا طلبہ کے اپنے مستقبل کے اعتبار سے بھی نقصان دہ ہے اور ملک و ملت کے مجموعی مفادات کے اعتبارات سے بھی سخت مضر ہے۔

صدر ایوب کی مصالحانہ روش

اس تازہ ایجی ٹیشن پر صدر ایوب کا ردعمل ہمارے نزدیک بہت صائب اور متوازن ہے۔ ان کے لئے ایک راستہ یہ بھی تھا کہ موجودہ صورت حال کو صرف "بعض شرپسند لوگوں" کی جانب منسوب کر کے تشدد کی راہ اختیار کر لیتے اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو بہرحال حکومت کی قوت اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی ہی۔ لیکن اس کے بجائے اپوزیشن کے ساتھ دستوری مسائل پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کر کے انہوں نے یقیناً دانش مندی کا ثبوت دیا ہے جس کی ہمارے نزدیک قدر کی جانی چاہیئے۔

دوسری طرف یہ پیچیدگی بھی ساتھ محسوس ہو رہی ہے کہ اپوزیشن نے اب تک جو موقف اختیار کئے رکھا ہے اور جس نہج پر اپنی سیاسی تحریک کو چلایا ہے اس کے پیش نظر اس کے کسی بھی عنصر کے لئے اس وقت حکومت کے ساتھ سیاسی گفت و شنید کی راہ اختیار کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں سے تو ظاہر ہے کہ اس وقت کسی گفتگو کا کوئی امکان ہی نہیں۔ انہیں تو اب اس ملک کی سیاست میں حقیقی اور واقعی اپوزیشن کا کردار ادا کرنا ہے۔ معاملہ جو بھی ہو سکتا ہے، دائیں بازو کے ان عناصر ہی سے ہو سکتا ہے جو ڈی اے سی اور صحیح تر الفاظ میں پی ڈی ایم میں شریک ہیں ——— لہٰذا پہلا خطرہ تو یہی ہے کہ مفاہمت کی ادنیٰ ترین کوششوں کو بھی بائیں بازو کی جماعتیں عوامی جدوجہد سے فرار اور عوامی مفادات سے غداری کے نام سے اچھالیں گی ——— پھر پی ڈی ایم خود کوئی ایک سیاسی جماعت نہیں بلکہ کئی سیاسی جتھوں کا مجموعہ ہے۔ مفاہمت کی گفتگو کے شروع ہوتے ہی ان کے باہم ایک دوسرے سے الجھ جانے کا امکان بھی خارج از بحث نہیں۔ گویا چند در چند وجوہ کی بنا پر صدر ایوب سے مفاہمت کی گفتگو فی الوقت ان لوگوں کے لئے بھی بہت مشکل ہو گئی ہے جن کا صدر ایوب اور حکمران پارٹی سے نظریات کا کوئی اختلاف نہیں اور جنہیں بعض فروعی دستوری معاملات کے ذیل میں اپنے بعض مطالبات منوا کر منطق کے ہر اصول کے مطابق موجودہ حکمران گروہ کے ساتھ "آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک" کی سی کیفیت سے بغل گیر ہو جانا چاہیئے۔

تاہم یہ وقت کا ایک اہم تقاضہ ہے جو ہماری رائے میں مشکلات اور موانع کے باوجود

پورا ہوگا ——— اور انتشار، لاقانونیت اور انارکی کے خطرات اور خصوصاً طالب علموں کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر ہمارے نزدیک فی الوقت ملک وقت کے مجموعی مفادات کے اعتبار سے یہی مناسب اور صحیح تر بھی ہے۔

اس مقصد کے لئے اس وقت خاص طور پر ایسے لوگوں کو میدان میں آنا چاہیئے جو تحریک مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ رہے تھے۔ لیکن بعد میں مختلف اسباب کی بنا پر میدان سیاست سے ہٹتے اور گوشہ گیر ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ اس وقت نہ کونسل لیگ سے وابستہ ہیں نہ کنونشن لیگ سے ——— متحدہ ہندوستان جب انگریز کی غلامی سے نجات پانے کی جدوجہد میں مصروف تھا تو بارہا ایسا ہوتا تھا کہ جب حکومت وقت اور تحریک آزادی کی علمبردار جماعتوں کے مابین کسی مسئلے پر ڈیڈلاک ہو جاتا تھا تو کچھ ایسے لوگ حرکت میں آتے تھے جو اپنی نرم طبیعت اور دھیمے مزاج کی بنا پر سرکار دربار میں بھی رسائی رکھتے تھے لیکن ساتھ ہی مخلص حب وطن بھی تھے۔ ایسے لوگ اگرچہ نہ تاریخ تحریک آزادی میں کسی نمایاں حیثیت کے مالک ہیں نہ ہی عوام نے انہیں کبھی اپنا ہیرو تسلیم کیا۔ تاہم اصحاب فہم و بصیرت جانتے ہیں کہ حصول آزادی کی جدوجہد میں انہوں نے بھی ایک مثبت کردار ادا کیا ہے ——— ہماری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ ہماری ملکی سیاست کی موجودہ پیچیدہ صورت حال بھی کچھ ایسے ہی لوگوں کے ناخن تدبیر سے سلجھ سکتی ہے۔ اور اگر ایسے لوگ اس مرحلے پر سامنے نہ آئے تو اندیشہ ہے کہ صورت حال پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی جائے گی اور انتشار بڑھتا چلا جائے گا جس سے پاکستان کا وجود تک خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

(۲)

ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق مارچ ۱۹۶۹ء

"غیر فوجی انقلاب"

وقت کا وہ "اہم تقاضہ" جس کی جانب ہم نے گذشتہ ماہ اشارہ کیا تھا ہونے کو تو پورا ہو گیا لیکن جو "موانع و مشکلات" اس کی راہ میں پیش آئی ہیں اور ان کے دوران پاکستان اپنی سیاسی تاریخ کے جس نازک ترین موڑ سے گذرا ہے اس کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہے۔

صدر ایوب کی گفت و شنید کی دعوت نے پوری ڈی۔ سی کو بالکل اچانک آ لیا تھا چنانچہ کچھ عرصہ تو وہ غریب شش و پنج میں مبتلا رہی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ صدر ایوب تو ایک فرد تھے انہوں نے ایک رخ پر چلتے چلتے اچانک اباؤٹ ٹرن کر لیا۔ لیکن ایک تحریک کی رواں دواں گاڑی کو تو بریک لگاتے لگاتے بھی آخر وقت لگتا ہے دوسری جانب یہ خطرہ بھی واقعی اور حقیقی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر ایک قیادت عوامی تحریک کو بریک لگا کر نیچے اترے اُدھر دوسری قیادت اس کے انجن کو دوبارہ سٹارٹ کر کے لے کر چلتی بنے۔ تیسری طرف یہ معاملہ بھی صاف تھا کہ اب یہ عوامی تحریک اگر مزید آگے بڑھتی تو اس کا روکنا مشکل تر ہو جائے گا اور پھر اس کا تمام تر فائدہ بائیں بازو کے لوگوں کے حصے میں آئے گا۔

یہ اسباب و عوامل تھے جن کی بنا پر وہ عمل اندرونی طور پر بڑی تیزی کے ساتھ لیکن ظاہری اعتبار سے بڑی تدریج اور مدھم چال کے ساتھ شروع ہوا جسے اب

مسٹر بھٹو بجا طور پر "غیر فوجی انقلاب" (CIVILIAN COUP DE TAT) سے تعبیر کر رہے ہیں[1]

مفاہمت اور مصالحت کا یہ عمل بنیادی طور پر تین لیگوں ہی کے مابین ہوا ہے اور اگر کوئی "عبوری قومی حکومت" وجود میں آئی جس کا امکان بالکل خارج از بحث نہیں تو وہ اصلاً ان لیگ ہائے ثلاثہ ہی پر مشتمل ہوگی۔

اس سے عمل کی مخالفت و مزاحمت بھی جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا بائیں بازو کے انتہا پسند لوگوں ہی کی جانب سے ہوئی۔ مسٹر بھٹو چونکہ ابھی کوئی مستحکم تنظیم نہیں رکھتے اور بدلتے ہوئے حالات نے گویا کم از کم وقتی طور پر تو ان کے پاؤں تلے سے زمین ہی کھینچ لی ہے لہٰذا انہیں محض منفعلانہ مخالفت (PASSIVE RESISTANCE) پر اکتفا کرنا پڑا۔ لیکن مولانا بھاشانی چونکہ اپنی پشت پر ایک واقعی عوامی سیاسی قوت بھی رکھتے ہیں لہٰذا انہوں نے اس مفاہمت کو برسرِ میدان للکارا اور بالفعل یہ کوشش کی کہ اب جبکہ ڈی اے سی عوامی تحریک کو بریک لگا رہی ہے وہ خود اس کی قیادت سنبھال کر اپنے پیشِ نظر انقلاب کی داغ بیل ڈال دیں۔

—— اور واقعہ یہ ہے کہ کم از کم مشرقی پاکستان میں اس "انقلاب" کی ابتدا ہو گئی تھی۔ فروری ۱۹۶۹ء کی سترہ تاریخ سے اکیس تاریخ تک کے چند دن واقعتہً پاکستان کی تاریخ میں وہ تیسرا نازک موقع تھے جبکہ پاکستان کا وجود سخت خطرے سے دوچار تھا۔ اور اس کی سالمیت سخت مشکوک ہو گئی تھی۔

پاکستان کی معجزانہ حفاظت کے پہلے دو مواقع

ہم نے گذشتہ ماہ ان صفحات میں بر سبیل تذکرہ عرض کیا تھا کہ "ہم تحریک پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا لیکن پاکستان کے معجز نما ظہور —— اور دو اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفظ و بقا کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیا اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور پورے عالم ارضی میں غلبہ اسلام کی خدائی اسکیم کی ایک کڑی ضرور ہے!" تحریک پاکستان کے اساسی محرکات اور پاکستان کے معجز نما قیام کے ضمن میں تو ہم اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ مارچ تا مئی ۱۹۶۷ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں ظاہر کر چکے ہیں۔ رہے وہ دو اہم مواقع جن پر ہمارے نزدیک پاکستان کے وجود و بقا کا تحفظ بالکل معجزانہ طور پر ہوا تو ان میں سے پہلا موقع تو وہ تھا جب صدر ایوب نے، اس وقت جبکہ وہ پاکستان کے سیاہ و سفید کے بالکل تنہا مالک تھے۔ امریکی اثرات کے تحت "متحدہ دفاع" (JOIN– DEFENCE) کی تجویز کی صورت میں گویا پاکستان کو چاندی کی طشتری میں رکھ کر بھارت کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت و

---

[1] عین اس مرحلے پر جبکہ پاکستان اس "غیر فوجی انقلاب" سے گذر رہا ہے۔ مسٹر آدم ملک وزیر خارجہ انڈونیشیا جہاں کچھ عرصہ قبل ایک باقاعدہ فوجی انقلاب آیا تھا کا دورہ پاکستان اور حکومت پاکستان کی طرف سے بھارت نو مفاہمت کے ساتھ مزید تعلقات بڑھانے کی خواہش کا اظہار بہت معنی خیز ہے!!

مشیت کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ پنڈت نہرو کی عقل اس وقت ماری گئی اور انہوں نے کمال رعونت کے ساتھ صدر ایوب کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا[1] اور اس طرح خالصتہً معجزانہ طور پر پاکستان کا مستقل وجود برقرار رہ گیا[2] ——— دوسرا موقع ۱۹۶۵ء کی جنگ تھی جس میں پاکستان کا بچ جانا کسی دنیوی حساب کتاب سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اس کی ایک ہی توجیہ ممکن ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو پاکستان کا تحفظ ہی مطلوب ہے!

ہمارے تجزیے میں ہر اعتبار سے ان دونوں مواقع ہی کے برابر نازک موقع سترہ تا اکیس فروری ۱۹۶۹ء کے چند دن تھے اور ہمارے نزدیک اگر اس موقع پر صدر ایوب وہ بھاری قیمت ادا نہ کرتے جو انہوں نے اولاً انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کر کے ادا کی جو ایک کھلے اعتراف شکست کے مترادف تھا اور پھر اگرتلہ سازش کیس واپس لے کر ادا کی جو داخلی و بین الاقوامی دونوں حیثیتوں سے سخت ذلت آمیز صورت تھی تو کم از کم مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی کے جاری کردہ "انقلاب" کو روکنے کی کوئی صورت ممکن نہ تھی! ———[3]

اور اس صورت میں مشرقی و مغربی خطوں کے حالات ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہو جاتے کہ پھر ان کے ساتھ رہنے کی کوئی صورت ممکن نہ رہتی اور عوامی جمہوریہ چین کی زیر سرپرستی مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال

---

[1] یاد رہے کہ بالکل اسی مقام سے پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کے 'چین نواز' دور کا آغاز ایک بالکل ناگزیر ضرورت کے طور پر ہوا تھا۔ راقم نے بارہا نجی گفتگوؤں میں اس صورت حال کو اس تشبیہ سے تعبیر کیا ہے کہ امریکہ کے زیر اثر صدر ایوب نے پنڈت نہرو اور بھارت کے سامنے رکوع تو کر لیا تھا لیکن پنڈت جی شاید اپنے تہذیبی پس منظر کی بنا پر چاہتے تھے کہ وہ باقاعدہ سجدہ کریں جسے ایک مسلمان کا بیٹا گوارا نہ کر سکا چنانچہ بجائے سجدہ کرنے کے صدر ایوب الٹے تن کر کھڑے ہو گئے اور اس کے بعد مسلسل نہ صرف بھارت بلکہ اس کے معنوی سرپرست امریکہ سے بھی دور ہوتے چلے گئے نتیجتہً پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کا جھکاؤ چین کی جانب ہوتا چلا گیا!

[2] یاد رہے کہ آنجہانی پنڈت نہرو ہی کی ایک پہلی حماقت کے نتیجے میں پاکستان اپنی موجودہ صورت میں دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا تھا ورنہ مسلم لیگ نے تو کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر لیا تھا اور اگر کبھی تین خطوں پر مشتمل 'مہا بھارت' ایک بار وجود میں آ جاتا تو پھر کسے معلوم کہ پھر علیحدگی کبھی ممکن ہو سکتی یا نہیں!

[3] مولانا بھاشانی کی سیاسی قوت کا جو مظاہرہ اس موقع پر ہوا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ شیخ مجیب الرحمان پیرول پر رہائی کی صورت میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہی نہیں بے تاب تھے۔ لیکن مولانا بھاشانی کی سیاست نے پورے ملک کو تعطل اور گومگو کی کیفیت میں مبتلا کئے رکھا تا آنکہ صدر ایوب نے مذکورہ بالا بھاری قیمت ادا کر کے مولانا بھاشانی کو بے بس کر دیا!

پر مشتمل ایک علیحدہ کمیونسٹ ریاست کے قیام کی راہ ہموار ہو جاتی[1]

ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے پاکستان اور اہل پاکستان پر کہ صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے اس موقع پر بالکل گھٹنے ٹیک دینے کی سخت ذلت آمیز کیفیت کو گوارا کر لیا اور اس طرح پاکستان کی سالمیت کو جو خطرہ لاحق ہو گیا تھا وہ کم از کم فوری طور پر ٹل گیا ——— !

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی پہلی نشست اگرچہ کل نصف گھنٹہ کی تھی اور اس کی نوعیت خالص رسمی ملاقات کی تھی تاہم اس سے آئندہ صورت حال کا پورا نقشہ سامنے آ گیا ہے اور اگرچہ فی الحال شرکائے کانفرنس بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں چنانچہ کسی جانب سے "عبوری قومی حکومت" کا نام لیا جا رہا ہے اور کوئی صرف نئے انتخابات تک کے لئے "عارضی نگران ادارے" کا نام لے رہا ہے۔ کوئی ۱۹۵۶ء کے دستور کی کامل بحالی کا مطالبہ کر رہا ہے تو کوئی بالکل نئے سرے سے دستور سازی کا تقاضہ کر رہا ہے۔ ون یونٹ توڑنے کا مطالبہ تو پرانا ہی تھا۔ اب شیخ مجیب الرحمان صاحب مشرقی و مغربی خطوں کے مابین مساوات (PARITY) کے اصول کو بھی ختم کرنے پر تل گئے ہیں غرضیکہ وہ تمام مسائل از سر نو اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جن کی بنا پر پاکستان میں دستور سازی کے کام میں ابتداءً تاخیر و تعویق ہوئی تھی اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ پاکستان کی ان تمام دستوری پیچیدگیوں کے حل کی عملی صورت کیا ہو گی ——— تاہم یہ بات واضح ہے کہ کنونشن، کونسل اور عوامی تینوں لیگوں ہی کے مابین کچھ لے اور دے کر اور کسر و انکسار کے اصول کے تحت کوئی معاہدہ ہو جائے گا اور ان ہی کے اتحاد و اتفاق سے کوئی مضبوط حکومت مرکز میں بن سکے گی۔

——— دوسری جانب یہ بھی بالکل واضح ہے کہ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو کے اتحاد سے اصل اپوزیشن وجود میں آئے گی اور مقابل کے اصل دھڑے یہی دو ہوں گے۔ باقی رہے ڈی اے سی کے دوسرے شرکاء تو ان میں سے بعض ادھر اور بعض ادھر ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان کا دولتانہ و قصوری گروپ اور مشرقی پاکستان کے شش نکاتی عوامی لیگ کے انتہا پسند طبقات اپوزیشن کے جانب آئیں گے۔ اور مذہبی جماعتوں میں سے جمعیت علمائے اسلام بلاواسطہ یا بالواسطہ ان ہی کے پلڑے میں وزن ڈالے گی ——— دوسری طرف نظام اسلام اور جماعت اسلامی چاہے فوراً حکومت میں شرکت کو ترجیح دیں یا فی الحال باہر رہنے کو پسند کریں۔ بہرحال متذکرہ بالا اتحادِ ثلاثہ کو سہارا دیں گی ——— !!

آئندہ کی سیاست کا عملی نقشہ یہ بنے یا کوئی اور، ہماری دلی خواہش جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا صرف یہ ہے کہ سارے معاملات سیاست کے کھلے میدان میں معروف طریقے پر طے ہوں اور نہ تشدد،

---

[1] مغربی بنگال کے درمیانی زمانے کے انتخابات کے جو نتائج حال ہی میں سامنے آئے ہیں ان کے پیش نظر یہ خطرہ خیالی و وہمی نہیں ——— بالکل حقیقی تھا ! ——— !

انارکی اور انتشار کی صورت پیدا ہو نہ انقلابی طور طریقے اختیار کئے جائیں۔

خدا کرے کہ اب ملک کے دونوں خطوں میں حالات معمول پر آجائیں۔ تعلیمی ادارے کھل جائیں اور زندگی کا عام کاروبار معمول کے مطابق جاری رہے اور طوفانی سیاست کی کوئی نئی لہر ملک کو اپنی گرفت میں نہ لے لے[1] اس لئے کہ اب اگر کوئی نئی لہر اٹھی تو اس کا رنگ یا بالکل مختلف ہوگا۔ صدر ایوب اور ان کی حکومت تو اب میدان سے عملاً ہٹ ہی گئے ہیں۔ اب اگر تصادم ہوا تو عوام کا عوام سے ہوگا اور اس کے نتائج نہایت سنگین ہوں گے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو دونوں اپنی موجودہ شکست کو کھلے دل سے قبول کرکے معروف طریقے پر اپوزیشن کا کردار اختیار کرلیں اور اپنی قوت کے مظاہرے اور کسی انقلابی اقدام کا خیال دل میں نہ آنے دیں ——— بصورت دیگر پاکستان کے مشرقی و مغربی دونوں خطوں میں عوامی تصادم شدید ترین صورت میں ظاہر ہوگا۔ مشرق میں اصل مقابلہ مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمان کے مابین ہوگا۔ اور مغرب میں مسٹر بھٹو اور جماعت اسلامی کے حامی طلبہ میں۔ مغرب میں تو دھمکیوں اور جوابی دھمکیوں کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ مشرق میں فی الحال خاموشی ہے۔ لیکن یہ خاموشی کسی بہت بڑے ٹکراؤ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے ——— !!

اللہ تعالیٰ ہی اس نازک موقع پر پاکستان کی حفاظت فرمانے والا ہے !!

(۳)

ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق مئی ۱۹۶۹ء

دوسرا مارشل لاء

ملک میں مارشل لا نافذ ہوئے سوا مہینہ ہو گیا ہے اور اس عرصے میں وہ گومگو کی سی کیفیت اور غیر یقینی سی صورت حال ختم ہو چکی ہے جو کسی اچانک تبدیلی کے بعد کچھ عرصہ تک فضا پر طاری رہتی ہے۔ اس دوران میں نہ صرف یہ کہ حالیہ فوجی حکومت کے ذمہ دار حضرات نے قوم کو بار بار یہ اطمینان دلایا ہے بلکہ اب تو ان کے طرز عمل سے بھی بہت حد تک ثابت ہو گیا ہے کہ نہ وہ کوئی سیاسی عزائم رکھتے ہیں اور نہ ہی اپنے دور اقتدار کو غیر ضروری طول دینے کے خواہش مند ہیں بلکہ ان کا مقصد محض ایک ایسی صورت حال کو جو بالکل بے قابو ہوتی جا رہی تھی قابو میں لانا اور ملک کی سیاسی زندگی کی گاڑی کو از سر نو صحیح پٹڑی پر ڈالنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ امر انتہائی اطمینان بخش ہے اور موجودہ فوجی قیادت اس پر پوری قوم کے تشکر و امتنان کی مستحق ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حالیہ مارشل لاء گذشتہ مارشل لا سے بہت مختلف ہے جو بڑی آن بان کے ساتھ ملک و ملت کے جملہ عوارض و امراض کی مسیحائی کے دعوے کے ساتھ آیا تھا اور جس نے صرف ایک نیا تنظیمی ڈھانچہ ہی نہیں بلکہ ایک مکمل جدید سیاسی فلسفہ اور مختلف گمراہ کن معاملات حتیٰ کہ دینی و مذہبی مسائل میں بھی ایک نیا

---

[1] افسوس کہ طوفانی سیاست کی یہ لہر اور عوامی مظاہروں اور ہنگاموں کا تیسرا شدید ریلا مارچ ۱۹۶۹ء ہی میں آ گیا۔ جس کے نتیجے میں صدر ایوب نے ملک کو فوج کے حوالے کر دیا اور پاکستان میں دوسری بار مارشل لا نافذ ہو گیا۔

اندازِ فکر قوم پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی ——— حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے معاملات مارشل لاء کے فطری دائرہ کار سے باہر ہیں۔ مارشل لاء کبھی کسی قوم یا ملک کے امراض و عوارض کا مستقل یا پائدار علاج نہیں بن سکتا۔ اس کی مثال زیادہ سے زیادہ ان فوری اور سریع الاثر مگر ناقص و وقتی اور عارضی افاقہ بخش ادویہ کی سی ہے جو کسی مرض کی بحرانی کیفیت میں فوری خطرے کو ٹالنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

ہم ان صفحات میں اس سے قبل بھی عرض کر چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ دیانت دار اور باضمیر سیاسی کارکنوں، منظم و محکم سیاسی جماعتوں اور مسلسل اور پیہم سیاسی سرگرمی کا فقدان ہماری قومی و ملی زندگی کا ایک عجیب اور خطرناک خلا ہے جسے لازماً پُر کیا جانا چاہیئے ——— اب ظاہر ہے کہ یہ خلا اگر پُر ہو سکتا ہے تو سیاسی سرگرمی ہی سے ہو سکتا ہے کوئی دوسری چیز اس کا بدل نہیں بن سکتی اور مارشل لاء ہرگز اس خلا کو پُر نہیں کر سکتا ——— مارشل لاء زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ ملک کی انتظامی مشینری کو پوری رفتار سے حرکت میں لے آئے، سستی اور کاہلی کا قلع قمع کر دے، سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں جمع شدہ کام تیزی سے پورا کرا دے۔ دھاندلی اور غنڈہ گردی کا سدباب کر دے۔ شہری زندگی کی بدعنوانیوں کا خاتمہ کرا دے اور سرکاری واجبات کی وصولی کا فوری بندوبست کرا دے اور الحمد للہ کہ یہ سارے کام پورے زور شور کے ساتھ اس وقت جاری ہیں ——— رہا ملک اور قوم میں فکری و نظریاتی ہم آہنگی پیدا کرنا اور ملک و ملت کو ایک جذبۂ تازہ دے کر سرگرم عمل کرنا تو ظاہر ہے کہ یہ کسی فوجی حکومت سے اس کی توقع کی جاتی ہے اور نہ ہی، خدا کا شکر ہے کہ ان معاملات میں موجودہ فوجی قیادت نے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ کسی بھی بڑی مہم کا آغاز ہی کیا ہے ——— خدا کرے کہ یہ صورت حال برقرار رہے ——— اور صدر مملکت آغا محمد یحییٰ خاں اپنی ذمہ داریوں میں اضافہ کرنے کی بجائے جلد از جلد ان سے سبکدوش ہونے کی کوشش کریں۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ایک طرف تو ہر چڑھتے سورج کی پرستش کو اپنا فرض عین سمجھتے ہیں اور دوسری طرف ہر اس شخص کو جو کسی وقت کسی طرح برسر اقتدار آ جائے قوت و اقتدار کے نشے میں مست کر کے اس کے ذریعے اپنا الو سیدھا کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں ——— ایسے لوگ سرو سبز میں بھی کثرت سے ہیں اور پرانے زمینداروں اور نئے صنعت کاروں میں بھی۔ حال ہی میں ان کی صفوں میں کچھ سرگرمی کے آثار بھی نظر آئے ہیں ——— خدا کرے کہ موجودہ فوجی قیادت ایسے لوگوں کے منحوس اثرات سے محفوظ رہے۔ اور کم سے کم مدت میں ان نازک ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر جو اس وقت اس کے کاندھوں پر آ گئی ہیں اپنی تمام تر توجہات اور مساعی کو اپنی اصل اور مستقل ذمہ داری یعنی دفاع وطن عزیز پر مرکوز کر دے۔

جمہوریت، سوشلزم
اور
اسلام

(۱)

اصل نوعیّت مسئلہ

"ہمارے نزدیک اس وقت ملک کی داخلی سیاست کے اصل بنیادی مسائل دو ہیں: ایک یہ کہ سیاسی اختیارات ——— جو مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر عوام سے بجائے نوکر شاہی کے قبضے میں چلے گئے ہیں۔ وہ اختیار و اقتدار کے اصل مالکوں یعنی جمہور کو منتقل کئے جائیں اور دوسرے یہ کہ دولت اور خصوصاً ذرائع پیداوار جو عوام الناس کے بجائے ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری بن گئے ہیں انہیں پوری قوم میں عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کیا جائے ——— گویا کہ پہلی "سلطانیٔ جمہور" کے نظام کے واقعی اور حقیقی نفاذ کی کوشش ہے اور دوسری "دورِ سرمایہ داری" کے منحوس اثرات اور نقوش کہن کو مٹانے کی سعی و جہد ہے۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں ہی کوششیں درست بھی ہیں اور مبارک بھی! اور ملک کے ہر ذی شعور شہری کا فرض ہے کہ وہ ان میں اپنی اپنی صلاحیت، استعداد اور قوت کار کے مطابق حصہ لے۔ اسلام کے نزدیک یہ دونوں ہی مقاصد محمود ہیں۔ اسلام ایک طرف اسے بھی گوارا نہیں کرتا کہ بندگانِ خدا کی گردنوں پر کوئی ایک فرد یا کچھ افراد یا کوئی مخصوص طبقہ خدائی کا تخت جما کر بیٹھے ——— اور دوسری طرف عدل و انصاف پر بھی انتہائی زور دیتا ہے۔ چنانچہ "وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ"[۱] آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں سے ہے اور "لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ"[۲] کتاب الٰہی کا مقصد نزول ہے اور "دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ"[۳] کی کوئی صورت اسلام کے نزدیک کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں!

لیکن افسوس کہ ہمارے یہاں اس وقت ان دونوں ہی میں شدید افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے۔ دائیں بازو کے اہل سیاست نے صرف پہلے کام پر نگاہوں کو مرکوز کر دیا ہے اور دوسرے معاملے کے ضمن میں وہ "وعدۂ فردا" سے

---

[۱] سورۃ شوریٰ۔ رکوع ۲، ترجمہ: "اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے مابین انصاف کروں!"
[۲] سورۃ حدید۔ رکوع ۳، " : "تاکہ لوگ عدل و انصاف کے نظام پر قائم رہیں!"
[۳] سورۃ حشر۔ رکوع ۱، ترجمہ: "(سرمائے) کا الٹ پھیر اہل ثروت ہی کے مابین!"

آگے قدم بڑھانے کو تیار نہیں اور مزید بدقسمتی یہ کہ "سلطانیٔ جمہور" کے ذیل میں بھی ان کے سارے تصورات یورپ کے مبنی بر الحاد فکر سے مستعار لئے ہوتے ہیں —— دوسری طرف بائیں بازو کے حامی لوگوں نے اپنی اصل توجہ دوسرے کام پر مرکوز کر دی ہے اور عدل اجتماعی کے لئے نظام بھی ان کے پیش نظر خدا کا عطا کردہ نہیں مارکس، لینن اور ماؤزے تنگ کا وضع کردہ ہے —— !!

اس صورت حال میں ہر اس شخص کے لئے جو اوّل و آخر صرف مسلمان ہو اور جس کے نزدیک دین و مذہب ہر چیز پر مقدم ہوں ایک اہم لمحۂ فکریہ ہے —— ایسے سب لوگوں کو خواہ وہ موجودہ سیاسی سرگرمی میں کسی حیثیت سے شریک ہوں، خواہ کسی خالص غیر سیاسی کام میں مصروف ہوں اس صورت حال کا بنظر غائر مطالعہ کرنا چاہیئے اور آئندہ پیش آنے والے حالات کے مدنظر دین کے احیاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مناسب لائحۂ عمل طے کر کے اس پر عمل پیرا ہو جانا چاہیئے ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!"

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق جنوری ۱۹۶۹ء)

—— (۲) ——

خواہ مخواہ کا بپتسمہ اور فتووں کا تکلف

حال ہی میں جمعیت علمائے اسلام کی پاکستان میں نشاۃ ثانیہ کے اصل معمار مولانا غلام غوث ہزاروی کے ایک بیان پر جو لے دے ہوئی ہے اس سے یہ بحث زور شور کے ساتھ شروع ہو گئی ہے کہ آیا سوشلزم کا اسلام کے ساتھ پیوند لگ سکتا ہے یا نہیں۔ ہم نے گزشتہ شمارے میں جمعیت کے بارے میں جو تفصیلی رائے پیش کی تھی، مولانا غلام غوث صاحب کے اس بیان سے اس کے اہم ترین جزو کی تصدیق ہو گئی۔ مولانا کے اس بیان کا اصل تعاقب حلقۂ دیوبند ہی کے ان علماء کی جانب سے ہوا ہے جنہوں نے ماضی میں تحریک مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا۔ ان حضرات کی ہمارے دل میں واقعتہً بڑی عزت ہے۔ لیکن انہوں نے سوشلزم کو اسلام کی عین ضد اور جمہوریت کو عین اسلام ثابت کرنے کے لئے جس قسم کے دلائل دیئے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے بھاری بھرکم لوگوں کی جانب سے اور ایسی بچگانہ باتیں[1]

[1] اس میدان میں اوّل اوّل تو مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی تشریف لائے تھے لیکن انہوں نے دعووں ہی پر اکتفا کی، دلائل کوئی نہ دیئے —— اس کے بعد جب ایک موقع پر اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے داعیٔ اعظم اور دورِ جدید میں اسلام کے مفکرِ اعلیٰ نے جمہوریت کے عین اسلام ہونے کے لئے یہ دلیل ارشاد فرمائی کہ "ہماری فقہ کی کتابوں میں جمہور کی اصطلاح کا بکثرت استعمال ہوا ہے!" تب تو واقعہ یہ ہے کہ "ناطقہ سر بگریباں" ہو کر رہ گیا —— کہ اب کوئی کیا کہے اور کیا لکھے —— اس سے کچھ کہنے سننے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی —— البتہ اس قدر گذارش کئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا کہ حضرت! اگر اسی اصول پر کسی نے یہ دلیل دے دی کہ چونکہ ہماری فقہ کی تمام کتابوں میں 'شراکت' پر مستقل باب موجود ہیں لہٰذا 'اشتراکیت' بالکل درست اور از روئے اسلام بالکل جائز ہے تو کس بھاؤ بکے گی؟

اسلام بلاشبہ اپنی ذات میں ایک مکمل نظام ہے اور اساسی عقائد و نظریات سے لے کر حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کی تفصیلی تشکیل تک اس کا اپنا ایک منفرد مزاج ہے جو کسی دوسرے نظریے یا نظام کی پیوندکاری قبول نہیں کرتا۔

چنانچہ نہ اس کے کسی جزو کا پیوند کسی اور نظام کو لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور نظام کے کسی جزو کی پیوندکاری اس کے ساتھ ممکن ہے۔ لیکن اگر اس بنا پر کہ اس کے سیاسی و انتظامی ڈھانچے کے بعض اجزا جمہوریت کے بعض اجزا سے جزوی مشابہت رکھتے ہیں، اس کا تعلق جمہوریت کے ساتھ قائم کیا جا سکتا ہے تو یقیناً اس کے معاشی نظام عدل و قسط کے بھی بعض اجزا سوشلزم کے بعض اجزا سے مطابقت رکھتے ہیں اور اس بنا پر اسلام کا رشتہ سوشلزم کے ساتھ بھی ممکن ہے ——— بلکہ ہمیں یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ خلافت راشدہ میں خلیفہ کی ذات میں اختیارات کا جس قدر ارتکاز تھا اس سے مشابہت کی بنا پر آمریت کا رشتہ بھی اسلام کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے ——— ! اسلامی نظام معیشت و حکومت کا عروج یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا اور اس عہد میں جہاں جمہوریت کا یہ عالم تھا کہ ایسے مظاہر دیکھنے میں آتے تھے کہ ایک عام مسلمان ان کو برسرِ منبر ٹوک دیتا تھا وہاں ان کے سفر بیت المقدس میں سوشلزم کی بلند ترین منزل کی شان بھی موجود ہے۔

ویسے ہمارے نزدیک ان دونوں ہی کے ساتھ اسلام کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرنا تر اتکلف ہے ہمارے یہاں نہ حامیانِ جمہوریت، جمہوریت کے داعی اس لئے بنے ہیں کہ انہیں اسلام کی بارگاہ سے اس کا حکم ملا ہے اور نہ ہی سوشلزم کے حامی اس کی جانب اس لئے جھکے ہیں کہ انہیں اسلام کا تقاضہ یہی معلوم ہوا ——— یہ سب کچھ تو تاریخ کے ایک عام بہاؤ کے تحت ہو رہا ہے جو گذشتہ دو تین صدیوں سے خالصتاً غیر مذہبی ولادینی رخ پر بہہ رہا ہے۔ اور جس میں مذہب سے سرے سے کوئی بحث (REFERENCE) ہی نہیں حامیانِ دین و مذہب کی اس عام بہاؤ کے زیر اثر پیدا ہونے والے مختلف رجحانات کو بپتسمہ دینے کی کوشش بالکل خواہ مخواہ ہے ——— !

موٹی سی بات ہے کہ فکر و فلسفے کے اعتبار سے موجودہ پوری دنیا کا امام تاحال یورپ ہے۔ اور جو خالص بے خدا و مادہ پرستانہ تہذیب وہاں سے اٹھی تھی وہ تاحال پورے کرۂ ارضی پر حکمران ہے۔ وہاں کے ازمنہ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) کی کوکھ سے خالص تاریخی عوامل کے زیر اثر جو جمہوری نظام برآمد ہوا تھا اس نے اولاً سیاسی شعبہ زندگی میں جمہوریت (DEMOCRACY) کی صورت اختیار کی۔ جس کے مختلف ممالک میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے۔ اسی جمہوریت نے بعد میں معاشی نظام میں آزاد معیشت کی راہ سے سرمایہ داری (CAPITALISM) کی کریہہ صورت اختیار کر لی جس کا ردِ عمل سوشلزم اور کمیونزم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جو درحقیقت نظریہ و فکر کے اعتبار سے اسی قدیم لادینی مادہ پرستانہ سلسلہ فکر کی اگلی منطقی کڑی اور نظام کے اعتبار سے سرمایہ داری کا قدرتی ردِ عمل ہے ——— اس ردِ عمل کے بھی مختلف ملکوں میں مختلف ایڈیشن تیار ہوئے اور اس میں مادر پدر آزاد معیشت کی تباہ کاریوں کی روک تھام میں انسان نے ایک دوسری انتہا پر پہنچ کر فرد کی آزادی کو بالکل سلب کر کے اسے اجتماعیت کے ہاتھ بھینٹ چڑھا

دیا ہے۔ اس کے باوجود چونکہ اس صورت میں بھی انسان اپنے اوپر کسی اور بالاتر اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا۔ لہذا سوشلزم کے تمام ایڈیشن بھی چاہے وہ روسی ہوں یا چینی مدّعی جمہوریت ہی کے ہیں ——— چنانچہ اس وقت عالمی کمیونسٹ تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ملک بھی "عوامی جمہوریہ چین" ہی کہلاتا ہے ——— !!

سیاسی و معاشی نظاموں کے انقلابات کا یہ سلسلہ اوّلاً تو صدی ڈیڑھ صدی میں تکمیل کو پہنچا تھا لیکن اب دنیا کے تمام زیرِ ترقی ممالک میں یہ داستان بڑی تیزی کے ساتھ دوہرائی جا رہی ہے اور یہ حالات کا ایک خالصتاً اپنا رخ ہے جو کسی مرحلے پر بھی دین و مذہب سے کوئی فتویٰ طلب نہیں کرتا۔ مفتیان دین و مذہب خواہ مخواہ اس کے مختلف موڑوں پہ اپنے دارالافتاء سے فتوے صادر کرنے کا تکلف کرتے رہتے ہیں۔

پاکستان بھی ایک نیم ترقی یافتہ اور نیم پس ماندہ ملک ہے اور اس میں بسنے والے عوام بھی ایک نیم خوابیدہ و نیم بیدار قوم ہیں۔ اس نیچے دروں و نیچے بیروں حالت میں جتنے دوسرے ممالک مبتلا ہیں، عام اس سے کہ وہ مسلمان ہیں یا غیر مسلم، جو کچھ وہاں ہو رہا ہے وہی یہاں ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے ——— اور ہوتا رہے گا۔ جب تک کہ دین و مذہب اس معاشرے میں واقعتہً ایک مؤثر عامل کی حیثیت اختیار نہ کر لیں ——— جس کے امکانات بحالات موجودہ دُور دُور تک نظر نہیں آتے !!

ہمارے اس وقت کے جملہ اجتماعی مسائل کی اصل صورت یہ ہے کہ :-

۱: آج سے اکیس سال قبل آزادی کی صورت میں دفعتہً جو سیاسی حقوق و اختیارات ہمارے ہاتھ آئے، ہم بحیثیت قوم اس کے اہل ثابت نہیں ہوتے اور چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ یہ حقوق و اختیارات عوام کے ہاتھوں تک کبھی پہنچے ہی نہیں بیچ ہی میں کچھ جاگیرداروں (FEUDAL LORDS) اور کچھ سابق حکمرانوں کی تربیت دادہ سروسز (SERVICES) نے انہیں اُچک لیا۔ خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ عوام اس کے لئے تیار نہ تھے لہذا رفتہ رفتہ یہ اختیارات پہلے چند پیشہ ور سیاست دانوں اور پھر ان کے بھی نااہل ثابت ہو جانے پر کلیتہً سروسز کو منتقل ہو گئے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے اور اس کا ردّ عمل عوامی جمہوریت کی بحالی یا از سرِ نو قیام کی کوششوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے !

۲: آزادی کے وقت ہمارا ملک ایک خالص زرعی ملک تھا۔ اور ان اکیس سالوں کے دوران رفتہ رفتہ صنعت نے ترقی کی تا آنکہ اب ہم ایک نیم زرعی و نیم صنعتی ملک بن چکے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ سارا کام مغرب سے مستعار لئے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے تحت ہوا ہے۔ لہذا ہمارے یہاں بھی سرمایہ داری اپنی کریہہ ترین صورت میں ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ چنانچہ ملک کی زرعی دولت پر جو اجارہ داری پہلے سے قائم تھی اس میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ ملک کی پوری صنعت و تجارت پر بھی چند خاندانوں کا قبضہ ہو گیا ہے ——— اس کے ردّ عمل کے طور پر یہاں بھی وہی کچھ سوچا جا رہا ہے جو دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں سوچا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ تقسیم دولت اور ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت کے پورے نظام کو بیخ و بن سے اکھیڑ ڈالا جائے

ظاہر ہے کہ یہ دونوں ردِ عمل تاریخ کے متذکرہ بالا عمومی بہاؤ ہی کے اجزا ہیں اور ان میں سے کسی کا بھی کوئی تعلق دین و مذہب سے نہیں!! ——— !!

لیکن چونکہ اتفاقاً ہمارے ملک کے عوام کو مذہب سے ایک جذباتی سا تعلق بھی ہے لہٰذا اس غریب کا نام خواہ مخواہ اچھالا جاتا ہے۔ خود تحریکِ پاکستان کے دوران بھی جس کے اصل اساسی عوامل معاشرتی و معاشی تھے، اس کا نام زور شور سے لیا گیا اور پاکستان کا مطلب ہی "لا الٰہ الا اللہ" بتایا گیا جس کی حقیقت آج روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ربع صدی گزر جانے کے باوجود اس غریب اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتنا ہی نام و نشان یہاں نظر آتا ہے جتنا ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ بلکہ ہمارے اندازے کے مطابق اس سے بھی کم ——— اور اب بھی مخصوص عمرانی نظریہ کے حامل لوگ خواہ مخواہ اس کا نام بدنام کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں ——— !!

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق فروری ۱۹۶۹ء)

شریعتِ اسلامی میں دستوری اور معاشی مسائل کے حل کے لیے وسیع گنجائشیں موجود ہیں

سوچنا چاہیے کہ اس وقت جو مسائل بالعموم ملک اور قوم کے سامنے ہیں ان میں سے آخر کون سے مسئلے کا کوئی خاص تعلق دین و مذہب سے ہے؟ طرزِ حکومت وحدانی ہو یا وفاقی، جمہوریت صدارتی ہو یا پارلیمانی، انتخابات بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ، مغربی پاکستان ایک صوبہ رہے یا دوبارہ متعدد صوبوں میں منقسم ہو جائے۔ جس طرح ان تمام مسائل میں اسلام کا کوئی ایک منصوص حکم نہیں ہے بلکہ حالات و ضروریات کے اعتبار سے مناسب تر کوئی صورت بھی اختیار کی جا سکتی ہے اسی طرح ان مسائل میں بھی اسلام میں حالات و ضروریات کے مطابق مناسب صورتیں اختیار کرنے کی بڑی گنجائش ہے کہ زمین کا بندوبست کن بنیادوں پر ہو اور بڑی بڑی صنعتوں اور ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت برقرار رکھی جائے یا انہیں اجتماعی ملکیت قرار دے کر حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ مزارعت کا مسئلہ ہمارے یہاں سلف سے متنازع فیہ چلا آ رہا ہے اور حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کو مجاہدین کے مابین تقسیم کرنے کی بجائے پوری ملتِ اسلامی کی اجتماعی ملکیت قرار دے کر ایک اہم اجتہاد فرمایا تھا جس پر پوری امت کا اجماع بھی ہو گیا تھا لہٰذا ان مسائل میں دلیل کی بنیاد پر کوئی ایک یا دوسرا موقف تو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنی کسی رائے کو اسلام کا حتمی موقف قرار دے کر بقیہ آراء کو کفر و الحاد قرار دے دینا یقیناً زیادتی اور حدود سے تجاوز ہے۔ ہم یہی مانتے ہیں۔ بالکل صحیح کہا ہے مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام مسائل و معاملات اور ان کی پیچیدگیوں اور مشکلات کا صحیح فہم حاصل کیا جائے اور ان کے حل کی مخلصانہ کوشش کی جائے نہ یہ کہ جو بھی ذرا عام روش سے ہٹ کر بات کرے اس کے خلاف کفر و الحاد کے فتووں کی توپیں داغنی شروع کر دی جائیں ——— !!

پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت کے علمبردار اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اب بعینہٖ قبل از مارشل لاء کی سی جمہوریت ملک میں دوبارہ قائم ہو سکتی ہے اور بالکل اسی طرح کے سے حالات لوٹ کر آ سکتے ہیں تو وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اس ملک میں

اب حقیقی عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو رہا ہے اور جمہور اب صرف اس بات پر کبھی قانع نہ ہوں گے کہ ان کو "ووٹ" کی صورت میں سرمایہ داروں سے کچھ "نوٹ" حاصل کرنے کا ایک کاغذی ساحق مل جائے بلکہ وہ اپنے تمام سیاسی و معاشی حقوق کے حصول کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے سے گریز نہیں کریں گے۔ اس صورت حال میں اگر کسی نے مذہب کو ان کے خلاف دلیل کی حیثیت سے استعمال کیا تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلے گا اور وہ یہ کہ مذہب کے ساتھ عوام کا رہا سہا تعلق بھی ختم ہو جائے گا اور مذہب سے بیزاری کی عام لہر چل نکلے گی۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ہوشمند لوگوں کو ان سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ (ماخوذ از تذکرہ و تبصرہ "میثاق" مارچ ۱۹۶۹ء)

(۴)

مذہبی سیاست کی بے بسی اور کرنے کا اصل کام

جمعیت علماء اسلام کا ذکر تو اس وقت رہنے دیجئے اس لئے کہ وہ پاکستان کی موجودہ سیاست کے میدان میں فی الحال نو وارد ہے اور ابھی اس کی سیاست کے خطوط بالکل مبہم ہیں۔ چنانچہ کبھی وہ این اے پی اور پی پی پی کے دوش بدوش نظر آتی ہے اور کبھی پی ڈی ایم سے اشتراک کرتی دکھائی دیتی ہے اور کبھی ایک پلڑے میں وزن ڈالتی ہے کبھی دوسرے میں ——— !!

البتہ جماعت اسلامی اس لئے قابل ذکر ہے کہ اسے پاکستان کی سیاسیات میں برسرعمل ہوئے پورے گیس سال بھی ہو چکے ہیں اور اس پورے عرصے میں وہ اس امر کی مدعی بھی رہی ہے کہ اس کا اصل مقصد اجیائے اسلام اور اقامت دین ہے !!

ذرا دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس پورے عرصے کے دوران اس کی دینی و مذہبی حیثیت اگر کوئی تھی بھی تو کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو چکی ہے اور وہ تاریخ کے بہاؤ کا رخ موڑنے کی بجائے خود متذکرہ بالا تاریخی بہاؤ کے رخ پر بہہ نکلی ہے ——— !! اور اب چاہے ایک مضبوط اور منظم گروہ کی حیثیت سے ملکی سیاست کے میدان میں اس نے اپنا کوئی وقار قائم کر بھی لیا ہو۔ دینی و مذہبی حیثیت سے اس کی سرے سے کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ——— !

پاکستانی سیاست کے افق پر اوّل اوّل جماعت اسلامی بڑے اعتماد اور طمطراق کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تحریک پاکستان کے جذباتی پس منظر کو اجاگر کر کے اور "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ" کے خالص مسلم لیگی نعرے کو اپنا کر، اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے نام پر وہ انقلاب قیادت کی مہم تنہا اپنے بازو کے بل پر بہت جلد سر کر لے گی۔ چنانچہ اس وقت اگر کسی اور نے اس کو تعاون و اشتراک کی پیش کش بھی کی تو اس نے نہایت حقارت کے ساتھ اس کو ٹھکرا دیا۔

لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ مسئلہ اتنا آسان نہیں اور تنہا اپنے زور بازو سے کام نہیں چل سکے گا تو جماعت نے مذہب ہی کے نام پر علماء اور مذہبی جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی اور ایک عرصے تک جماعت اسلامی کی مذہبی سیاست "علما کے متحدہ و متفقہ مطالبات" کی بنیاد پر چلتی رہی۔

لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد پھر محسوس ہوا کہ چڑھائی بہت سخت ہے اور گاڑی اس سیکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں

پڑھ سکی تو ایک قدم اور پیچھے ہٹ کر خالص "جمہوریت" کے نعرے پر سیاست کی نئی بساط بچھائی گئی جس پر تا حال سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے ——— !! ——— اور جس کا مظہر کمال یہ ہے کہ "ڈی اے سی" میں بھی پاکستانی سیاست کے اکھاڑے کے دونوں مذہبی پہلوان اس وقت مجتمع ہیں۔ اس کے مطالبات اور متفقہ نکات میں غریب اسلام کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں!

خدا شاہد ہے کہ ہمارے پیش نظر کسی جماعت کی تنقیص ہرگز نہیں۔ ان گذارشات سے ہمارا مقصد صرف اپنی اس رائے کی وضاحت ہے کہ موجودہ سیاست کا دین و مذہب سے قطعاً کوئی تعلق نہیں اور وقت کا جو دھارا خالص غیر مذہبی ولادینی رخ پر بہہ رہا ہے اس کی مختلف لہروں کی باہمی آویزش میں اسلام کا نام استعمال کرنا اور خاص طور پر اسے موجودہ بوسیدہ، گلے سڑے اور ظالمانہ و استحصالی نظام معیشت کا پشت پناہ بنا کر کھڑا کر دینا اسلام کی دوستی نہیں اس کے ساتھ دشمنی ہے۔ تاریخ کے رخ کا جو 'دھارا' ایک خاص سمت میں بہہ رہا ہے، اس کا رخ مذہب کی جانب موڑنے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے فلسفہ و فکر کے میدان میں انقلاب برپا کیا جائے اور روحانی اقدار کا از سر نو احیا ہو۔ ایمان و یقین کی روشنی دنیا میں پھیلے اور اخلاق و اعمال میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں۔ جب یہ انقلاب کسی انسانی معاشرے میں ایک معتد بہ حد تک رونما ہو چکے گا تب کہیں جا کر اس کا امکان پیدا ہو گا کہ اس کی سیاست بھی مذہب کے تابع ہو۔ اور وہاں خدا پرستانہ نظام زندگی پوری شان کے ساتھ جلوہ آرا ہو سکے ——— ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہمارا موجودہ پاکستانی معاشرہ ان اعتبارات سے دین و مذہب کی روح سے بہت بعید ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا جن کا اصل تعلق اسلام اور صرف اسلام سے ہو۔ اور جن کی زندگیوں کا مقصود صرف اور صرف احیائے اسلام و اقامت دین ہو، موجودہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا اپنی قوتوں، صلاحیتوں اور اوقات کو ضائع کرنا ہے۔ ان کے لئے ایک ہی راہ کھلی ہے اور وہ یہ کہ ——— اگر علمی و فکری کام کرنے کی استعداد رکھتے ہوں تو تعلیم و تعلّم قرآن کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیں اور کتاب اللہ کے علم و حکمت کی تحصیل و اشاعت میں مصروف ہو جائیں۔ اس لئے کہ ایمان و یقین کے احیا کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ——— اور اگر علمی کام سے مناسبت نہ رکھتے ہوں تو معاشرے کے کونوں کھدروں میں بیٹھ جائیں اور خلوص و اخلاص کی قوتوں کو بروئے کار لا کر عوام الناس میں دینی و روحانی اقدار کی از سر نو ترویج کی کوشش کریں۔

ہم تحریک پاکستان کے بارے میں تو یہ رائے نہیں رکھتے کہ اس کا اساسی محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا، لیکن پاکستان کے معجزنما ظہور ——— اور دو اہم مواقع پر اس کے معجزانہ تحفظ و بقا کی بنا پر یہ احساس ضرور رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام دین کے احیاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور پورے عالم ارضی میں غلبۂ اسلام کی خدائی سکیم کی ایک کڑی ضرور ہے۔ اور اسی بنا پر ہمیں اس کا بقا و وجود بھی عزیز ہے اور اس میں انتشار اور فساد کی کسی صورت گوارا نہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس مبارک انقلاب کی ابتدا سیاسی میدان

سے نہیں بلکہ علم و فکر اور فلسفہ و حکمت کے میدان سے ہوگی۔ اور ایک علمی و تعلیمی انقلاب کے سوا اس کی کی کوئی راہ موجود نہیں ——— اس میدان میں بالکل ابتدائی اور کمیت کے اعتبار سے نہایت حقیر کوشش کئے چلے جانا بھی چاہئے اس سے کوئی محسوس نتائج سامنے نہ آئیں۔ ہمارے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ سیاسی میدان میں بلند بانگ دعاوی کے ساتھ شرکت کی جائے۔ لیکن بجائے اس کے رُخ کو دین و مذہب کے جانب موڑنے کے خود اس کی رو میں بہہ جایا جائے! ؎

دیکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے !!

اللہ تعالیٰ ہمیں مسلمان جیئے اور ایمان پہ مرنے کی سعادت نصیب فرمائے !! ——— آمین !

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق فروری ۱۹۶۹ء)

———— (۵) ————

مارشل لاء کے نفاذ سے قبل مسلسل پانچ چھ ماہ سے جو ہنگامی صورتِ حال پورے ملک پر جاری چلی آ رہی تھی اس کے یک لخت خاتمے سے جو پُر سکون کیفیت پیدا ہوئی اس میں ملک و ملت کے بہی خواہوں میں سے بہت سے اصحاب فکر و نظر نے ان عوامل کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے جن کے نتیجے میں ہمارے یہاں سیاسی عدم استحکام اور فکری و نظریاتی انتشار پیدا ہوا ہے اور یوماً فیوماً بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ اخبارات و رسائل میں بہت سے عمدہ مضامین اس موضوع پر شائع ہوئے ہیں جن سے یہ تو مزید معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے اصحاب فکر و نظر اس امر کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ قوم میں فکر و نظر کی وہی یک جہتی اور جذبہ و عمل کی وہی ہم آہنگی دوبارہ پیدا کی جائے جو آج سے تقریباً ربع صدی قبل کچھ عرصے کے لئے ملتِ اسلامیہ پاک و ہند میں پیدا ہوئی تھی اور جس کے نتیجے کے طور پر پاکستان وجود میں آیا تھا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ اس وقت وہ کیفیت کیوں اور کن اسباب و عوامل سے پیدا ہوئی تھی اور آج اسے کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مبہم طور پر یہ کہہ دینا کہ اس وقت بھی وہ جذبہ اسلام کی بنیاد پر پیدا ہوا تھا ——— اور آج بھی اسے اسلام ہی کی بنیاد پر دوبارہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شاعری میں تو شاید روا ہو لیکن ملک و ملت کے ٹھوس مسائل سے بحث کرنے والی سنجیدہ علمی تحریروں کے شایانِ شان نہیں ——— اس لئے کہ اس کے معاً بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ سب کچھ اسلام ہی کی بنیاد پر تھا تو بعد میں وہ ختم کیوں ہو گیا؟ جبکہ اسلام سے نہ اس قوم کے عوام منحرف ہوئے نہ خواص ——— بلکہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا جو یہاں کبھی کسی حیثیت سے برسرِ اقتدار رہا ہو اور اٹھتے بیٹھتے اسلام کا کلمہ نہ پڑھتا رہا ہو اور اپنے جملہ مسائل و مشکلات کا حل اسلام ہی میں نہ بتاتا رہا ہو۔

ہمارے یہاں "اسلام!" ——— "اسلام!" اور "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے اس وقت جس زور شور کے ساتھ لگ رہے ہیں، وہ یوں تو ہمارے لئے وہ ہر حال میں خوش آئند ہیں اور ہم بہر صورت انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج سے ربع صدی قبل کسی محکم اور پائیدار اساس کے بغیر محض جوا میں ان نعروں کی گونج پیدا کر کے مسلسل بائیس سال تک ہم جس طرح ان کی مٹی پلید کرتے آئے ہیں، ہمیں خدشہ

ہے کہ آج جس انداز سے یہ نعرے لگ رہے ہیں اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ مستقبل میں ان کی حرمت کو کچھ اور بھی زیادہ ہی بٹا لگایا جائے گا اور ان مقدس الفاظ کی رسوائی پہلے سے بھی کچھ سوا ہی ہوگی۔ اس کا تھوڑا سا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت جو جلوس یہ نعرے لگاتے تھے ان میں شامل خواتین کی اکثریت با پردہ اور برقع پوش ہوتی تھی —— اور آج وہ نوجوان لڑکیاں ان کی علمبردار ہیں جو پردے اور برقعے کی قید سے بالکل آزاد ہو چکی ہیں اور نیم عریاں ٹیڈی لباس میں ملبوس ہیں —— ع "قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا!"

ہمارے یہاں اس وقت جن اصحاب قلم و قرطاس نے "اسلام" کی دہائی دی ہے ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو "سوشلزم" کے ہوّے سے خوفزدہ ہو کر اسلام کی پناہ گاہ کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور جن کے دین و مذہب سے تازہ شغف کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ع

"جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا!"

ان کو ایک طرف رکھتے ہوئے بعض ایسے حضرات کا حال بھی جن کے خلوص اور اخلاص کے ہم بھی معترف ہیں اور جن کے بارے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ اسلام کے قدیم شیدائی و فدائی ہیں یہ ہے کہ خود ان کا مسجد سے کوئی رشتہ و تعلق نہیں اور ان کی جوان لڑکیاں بے پردہ گھومتی اور "تارکِ عالم" کا لقب پاتی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

خدا کے لئے حقائق کا مواجہہ کرنا سیکھئے! —— حقائق سے گریز محض خود فریبی ہے، اس سے نہ ارض و سماء دھوکا کھاتے ہیں، نہ خالق ارض و سماوات، اور "وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ!" کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا —— واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے تو پوری اُمتِ مسلمہ بحیثیت مجموعی کب کی دستبردار ہو چکی۔ دین و مذہب کے ساتھ اس کا مخلصانہ رشتہ استوار ہوتا تو یہ عالمگیر ذلت و رسوائی سے دوچار ہی کیوں ہوتی۔ غلطی "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○" میں نہیں اُمت کے دعوےٰ ایمان میں ہے ؎

میرؔ کے دین و مذہب کی کیا پوچھو ہو جی، ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

مدت مدید گزری کہ اسلام کا شجرہ طیبہ بیخ و بن سے اکھڑ چکا۔ اور اب از سر نو تخم ریزی و آبیاری کا محتاج ہے دین و مذہب کی عمارت محض شکستہ ہی نہیں ہوئی کہ اِدھر اُدھر کی مرمت سے کام چل جائے۔ یہ عظیم تعمیر کبھی کی زمین بوس ہو چکی اور اگرچہ اس کے کھنڈر اب بھی اس کی عظمتِ رفتہ کے شاہد ہیں۔ تاہم اب ضرورت بالکل بنیاد سے از سر نو تعمیر کی ہے اور افسوس کہ اُمتِ مسلمہ تاحال اس حقیقت کے اعتراف تک پر آمادہ نہیں۔ بلکہ مسلسل مغالطے ہی میں مبتلا رہنے پر مصر ہے ——! تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے اگر ہر تدبیر الٹی پڑتی نظر آتے۔ اور کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ آج سے ربع صدی قبل ملتِ اسلامیہ ہند و پاک کی بابی کردھی میں جو اُبال آیا تھا اس کا اصل محرک دینی و مذہبی جذبہ تھا۔ نہ آج اس کی ملی و اجتماعی زندگی میں دین و مذہب کو کسی مؤثر عامل کی حیثیت حاصل ہے! اس وقت کا سارا جوش و خروش ایک ایسی قوم کے جذبۂ تحفظ و خود اختیاری کا رہینِ منت تھا۔ جس کی بنیاد تو

صدیوں پہلے مذہب ہی کی اساس پر قائم ہوئی تھی۔ لیکن جس کا دین و مذہب سے تعلق اب محض برائے نام رہ گیا تھا اور جسے کچھ مخصوص حالات میں یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہی کا قومی تشخص ختم ہو جائے گا اور وہ ایک بڑی قومیت میں جذب ہو کر رہ جائے گی۔ اس خالص قومی تحریک کے آخری ایام میں خالص وقتی اور عارضی طور پر کچھ رنگ آمیزی دینی و مذہبی جذبے کی بھی کی گئی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ ایک فوری ضرورت (EXPEDIENCY) کے تحت تھا۔ نہ کہ کسی مستقل اور مکمل اساس پر ——— چنانچہ جب تحریک ایک حد تک کامیاب ہو گئی اور اس قوم کو اپنے معاشی و سیاسی تحفظ کی ضمانت کے طور پر ایک علیحدہ خطہ مل گیا تو وہ جوش و خروش بھی فوراً ختم ہو گیا ——— اور دوبارہ اس کا سراغ کبھی ملا تو صرف اس وقت جب ایک بار پھر ۱۹۶۵ء میں خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں قوم کا یہ دفاعی حصار ٹوٹ نہ جائے ——— اور ہندو امپریلزم کا سیلاب اس قوم کو بہا کر نہ لے جائے ——— پھر جونہی یہ خطرہ دوبارہ ٹلا وہ جذبہ بھی سرد پڑ گیا ——— ! اور پھر وہی صورت حال طاری ہو گئی ع

"اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر"

یہ ہیں وہ حقائق جن کا ادراک اس لئے ضروری ہے کہ ملک و ملت کا ہر بہی خواہ اچھی طرح سمجھ لے کہ مسئلے کی حقیقی نوعیت کیا ہے ——— اور اصلاح احوال کے لئے کس جگہ سے کام کی ابتدا لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ علاج کی کامیابی کا سارا دار و مدار تشخیص کی صحت و درستی پر ہے ——— ہمارا مرض سطحی نہیں، بہت گہرا اور نہایت مزمن ہے، اس کا علاج بھی سطحی تجاویز سے نہیں بڑی گہری حکیمانہ تدبیر ہی سے ممکن ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کی جرأت شاید ہی کوئی کر سکے کہ پاکستان کا استحکام ہی نہیں محض وجود و بقا بھی اسلام ہی سے وابستہ ہے ——— لیکن خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ اسلام اس وقت ہمارے عقیدہ و عمل دونوں سے خارج ہو چکا ہے اور اب اس کی بازیافت محض نعروں، تقریروں، مقالوں اور بیانوں سے ممکن نہیں ———

اس کے لئے مسلسل اور پیہم جدّ و جہد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس جدّ و جہد کا اصل اور اوّلین میدان علم و فکر کا میدان ہے ——— اور علم و فکر کا رشتہ ایمان و یقین کے ساتھ از سر نو استوار کرنا وقت کی اہم ترین اور مقدم ترین ضرورت ہے ——— پھر اخلاق و اعمال کی دنیا میں انقلاب لانا لازمی ہے ——— اس لئے کہ تطہیر فکر اور تزکیۂ اخلاق کی کٹھن مہموں کے سر ہونے کے بعد ہی اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ قوم کے رگ و پے میں دینی و اسلامی جذبہ سرایت کر جائے اور "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کی صورت عملاً پیدا ہو۔

ہماری ان گذارشات سے ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو یہ بدگمانی پیدا ہو کہ شاید ہم فوری طور پر اسلامی نظام کے قیام کی کوششوں کے حامی نہیں، یا یہ کہ ہم پر مایوسی کا غلبہ ہے ——— حالانکہ درحقیقت صورت واقعہ نہ یہ ہے نہ وہ ——— ہم تجدید دین اور احیائے اسلام کی ہر کوشش کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اور خود بھی بحمد اللہ اپنی علالتوں کی حیرت سی پونجی کو اسی مقصد کے لئے کھپا دینے کا عزم مصمم رکھتے ہیں۔ پھر ہم یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ بہت

جملہ انسانیت اپنے مسائل کے حل اور اپنے دکھوں کے مداوا کے لئے اسلام ہی کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہوگی اور وہ دور زیادہ دور نہیں جب پورے عالم ارضی پر اسلام ہی کا غلبہ ہوگا ——— لیکن اس کے لئے کیا کام ——— اور کس طرح سے کیا جانا چاہیئے۔ اس کے بارے میں ہمارا ایک پختہ نقطۂ نظر ہے اور ہم علیٰ وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ یہ کام کس نہج پر کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں دکھ ہوتا ہے تو اس وقت، اور ہمارے لہجے میں تلخی پیدا ہوتی ہے تو تب جب ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے بھلے سنجیدہ لوگ اس معاملے میں غالباً صرف تساہل فکر کی بنا پر محض سطحی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں اور مسئلے کی حقیقی و واقعی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ——— اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دل میں ایک بے اختیار ہُوک اٹھتی ہے اس وقت جب ہمیں خیال آتا ہے کہ برصغیر کی ایک اچھی بھلی دینی تحریک جو صورت حال کی صحیح تشخیص کے ساتھ ایک بہت حد تک صحیح طریق کار پر برسرِ عمل ہوئی تھی ——— وہ بھی قیام پاکستان کے وقت، حالات اور مواقع کی ایک وقتی سی ترغیب و تحریص (TEMPTATION) کے زیر اثر اپنے مؤقف سے منحرف اور اپنے نہج کار سے دستبردار ہوگئی اور سطحیت فکر و عمل کا شکار ہوکر وہی خالی نعرے لگانے میں مصروف ہوگئی جن کی شدید مذمت ماضی میں وہ خود کرتی رہی تھی ——— اور آج بھی جبکہ تقریباً ربع صدی گذر چکی ہے وہ سیاست کے ریگزار میں حکومت و اقتدار کے سراب کے پیچھے بھٹکتی پھر رہی ہے فاعتبروا یا اولی الابصار ——— اس تحریک کا خیال ہمیں بار بار اس لئے آتا ہے کہ خود ہم نے اسی تحریک کی گود میں آنکھ کھولی تھی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تڑپ اسی کے طفیل پائی تھی ؎

گذشتہ منزلیں منزل بہ منزل یاد آتی ہیں
مسافر یہ خلش دل کی بآسانی نہیں جاتی!

دین و مذہب سے قطع نظر کہ وہ بے چارے تو ہمارے یہاں اب صرف بوقت ضرورت، استعمال کے لئے رہ گئے ہیں، اور اسلام و ایمان کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہ وہ غریب صرف لیڈروں کی تقریروں کا مطلع و مقطع فراہم کرنے کے کام آتے ہیں، خالص قومی سطح پر بھی غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ ہم زندہ قوموں کے لازمی اوصاف سے خطرناک حد تک تہی دست ہیں اور اس میدان میں بھی ہماری تہی دامنی روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے ——— ہماری قومی و ملی زندگی جس طرح پے بہ پے حادثوں سے دوچار ہو رہی ہے اور ملی سیاست کی گاڑی جس طرح بار بار زور دار ٹھوکروں کے ساتھ رک جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ آزادی ایسی نعمت عظمیٰ کے حصول سے قبل قومی تعمیر کا کام جس حد تک لازماً ہو جانا چاہیئے تھا وہ ہمارے یہاں نہیں ہوا۔ اور اس عظیم ذمہ داری سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے کے لئے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی وہ ناگزیر حد تک بھی پیدا نہیں ہوئیں۔ گویا آزادی ہمیں ایک ایسے عطیے کی حیثیت سے ملی جس کے لئے ہم عملاً تیار نہ تھے۔

یہ صورت حال بہت مشابہ ہے اس کیفیت سے جس سے بعض وہ طالب علم جو نچلے درجوں میں رعایتی پاس ہوتے چلے آتے ہیں کسی بڑے امتحان کے موقع پر دو چار ہو جاتے ہیں ——— کہ

لاکھ کوشش کرنے پر بھی ان کی وہ بنیادی کمی کسی طرح پوری نہیں ہوتی جو بالکل ابتدا میں رہ گئی تھی!

برصغیر کی ہندو قوم میں قومی تعمیرِ نو کا کام انیسویں صدی کے اواخر ہی سے شروع ہو گیا تھا اور بیسویں صدی کی ابتدا سے تو اس میں بے پناہ جوش و خروش اور جذبۂ عمل پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہر جہت اور ہر سمت میں تعمیر و اصلاح کا کام تیزی کے ساتھ شروع ہوا، بے شمار انجمنیں بنیں، لاتعداد ادارے وجود میں آئے، ہزاروں ٹرسٹ قائم ہوئے، چھوٹی بڑی لاکھوں درس گاہیں تعمیر ہوئیں —— اور لکھوکھا قومی کارکن جذبۂ اخلاص کے مظہر، سادگی و کفایت شعاری کے پیکر اور مجسم قربانی و ایثار بن کر میدانِ عمل میں کود پڑے —— پھر تعمیرِ جدید کا یہ کام کسی ایک ہی میدان میں نہیں ہوا بلکہ ایک طرف اگر سیاسی میدان میں ہلچل اور ہماہمی تھی تو دوسری طرف خالص معاشرتی اور سوشل اصلاح اور معاشی فلاح و بہبود کے لئے بھی زور شور سے کام جاری تھا اور ایک طرف مذہبی اصلاح و تجدید کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اور مذہبی افکار کے تنقیدی جائزے اور ان میں شکست و ریخت اور تالیفِ جدید سے نئے نئے دھرم ایجاد ہو رہے تھے۔ تو دوسری طرف صحت و تندرستی کے اصولوں کے پرچار اور ورزش و ریاضت کے عملی پروگراموں سے جسم اور جسمانی قوتوں کے نشو و نما کا کام بھی پورے انہماک سے ہو رہا تھا —— غرض ہر شعبۂ زندگی میں ایک نئی ہلچل اور نئی سرگرمی پیدا ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں پوری ہندو قوم میں بیداری اور حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی اور فی الجملہ آزادی کی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور استعداد اس میں پیدا ہو گئی۔

مسلمان قوم میں صورت اس کے برعکس رہی اس کی اکثریت 'عظمتِ رفتہ' کی یاد ہی کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی اور "پدرم سلطان بود" کا راگ الاپ کر ہی دل کو تسلی دیتی رہی۔ قومی و ملی تعمیرِ جدید کا کام تقریباً نہ ہونے کے برابر رہا اور تعطل اور جمود کا تسلط اور بدنظمی، انتشار اور طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ ہم اسی حال میں تھے کہ دفعۃً محسوس ہوا کہ غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ ہونے کو ہے اور اس صورت میں ہندوستان کی مسلمان قوم ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر رہ جائے گی۔ چنانچہ فوری طور پر اپنے قومی تشخص کے تحفظ کی ضرورت محسوس ہوئی اور جیسے تیسے ایک قومی تحریک اٹھی جسے ابتداءً صرف کچھ نوابوں اور جاگیرداروں کی پشت پناہی حاصل تھی اور جس کا دائرہ کار ابتدا میں صرف کچھ آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر قوم کے وہ مذہبی طبقات اس سے بدظن بھی ہو گئے جو حریت و آزادی کی راہ میں مسلسل قربانیاں دیتے آتے تھے اور جن میں عوامی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی اور اس طرح قوم بے شمار مخلص کارکنوں سے محروم ہو گئی —— آزادی سے متصلاً قبل ایک دو سال کے لئے اس قومی تحریک میں بھی کچھ عوامی رنگ پیدا ہوا تھا لیکن ابھی اس کے کارکن بالکل خام حالت ہی میں تھے کہ آزادی کی گھڑی آ پہنچی اور اللہ تعالیٰ نے ایک خصوصی عطیے اور انعام کے طور پر اس قوم کو بھی ایک علیحدہ آزاد مملکت مل گئی۔

پھر آزادی کیا ملی —— گویا دولت و ثروت کا سیلاب آ گیا جو قوم کی دیانت و شرافت اور خلوص و اخلاص کی رہی سہی پونجی کو بھی بہا کر لے گیا۔ اولاً متروکہ دولت پر چھینا جھپٹی ہوئی پھر تجارت و صنعت کے میدانوں میں دولت کے دریا بہنے لگے، دیکھا دیکھی سرکاری ملازموں نے بھی ہاتھ رنگنے شروع کئے اور دشتِ دولت کے "ہر آبلہ پا سے زبردستی خراج" وصول کرنا شروع کیا —— غرض پوری قوم کے سر پر دولت کا بھوت سوار ہو گیا —— قومی تعمیرِ نو کا کام پہلے ہی نہیں ہوا تھا جبکہ اس کے لئے تمام تر اسباب و عوامل بھی موجود تھے۔ تو اب کیا خاک ہوتا! خلوص، دیانت، ایثار اور قربانی نام کی

کوئی شے پہلے کہیں کچھ موجود تھی بھی تو اس دور میں بالکل ختم ہو گئی۔ ذمہ داری، احساسِ فرض، تندہی اور محنت کالعدم ہو گئے سیاست نے ایک کاروبار کی صورت اختیار کر لی۔ اور روپے پیسے یا زیادہ سے زیادہ کنبہ و برادری کے سوا اس میدان میں کوئی سِکّہ رواں نہ رہا۔ چنانچہ طبقہ متوسط کے وہ لوگ جو قومی تحریک کے آخری ایّام میں ملّی و قومی جذبات کے تحت سیاست کے میدان میں آ گئے تھے رفتہ رفتہ مایوس اور بد دل ہو کر اسے خیر باد کہہ گئے۔ اور سیاست اور حکومت کا پورا معاملہ صرف بڑے بڑے زمینداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا مشغلہ بن کر رہ گیا۔ ان میں سے جو کبھی کسی وجہ سے مات کھا جاتا تھا ایسے خاموش اور بیکار ہو کر بیٹھ رہتا تھا جیسے سیاست بازی کے علاوہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لئے کرنے کا کوئی اور کام ہے ہی نہیں ——— نتیجۃً سیاسی اختلال پیدا ہوا۔ جوڑ توڑ اور سازشوں کا بازار گرم ہوا، حکومتیں آئے دن بدلنے لگیں۔ بین الاقوامی ساکھ اور قومی و ملکی معیشت کا دیوالہ نکل گیا ——— تو پہلا مارشل لاء لگا ——— جس نے کچھ عرصہ کے لئے ان امراض کی ظاہری علامتوں کو دبا دیا۔ لیکن جونہی خالص فوجی حکومت سے کسی قدر سیاسی و دستوری حکومت کی طرف رجعت ہوئی وہی پہلا سماں پھر بندھ گیا۔ اور علاماتِ مرض پھر ظاہر ہو گئیں ——— بلکہ حالت پہلے سے بدتر ہو گئی ——— !!

یہ ہیں وہ حالات جن سے ہم بحیثیت قوم دوچار ہیں ——— کہ قوم کے سوادِ اعظم کے پیشِ نظر نہ کوئی نظریہ ہے نہ مقصد، نہ قومی و ملی ذمہ داریوں کا احساس ہے نہ شہریت کے فرائض کا ——— پھر نہ کوئی مستحکم قومی تنظیم موجود ہے نہ قابلِ اعتماد قومی قیادت۔ سیاسی شعور کی کمی کا یہ حال ہے کہ جو چاہے وقتی طور پر نعرے لگاتے اور عارضی طور پر قوم کو اپنے پیچھے لگا لے ——— اور قیادت کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ جس شخص کے بارے میں ذرا یہ معلوم ہو کہ دیانت دار اور مخلص آدمی ہے۔ قوم بالکل یتیموں کی طرح سرپرستی کے لئے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیتی ہے چاہے وہ سیاست کے میدان میں بالکل نووارد ہی ہو اور سیدھا کسی سرکاری محکمے کی ملازمت سے فارغ ہو کر چلا آ رہا ہو ——— وقِس علیٰ ھٰذا۔

اس میں شک نہیں کہ حال ہی میں بعض گروہ ایسے بھی سامنے آئے ہیں جو کچھ واضح نظریات بھی رکھتے ہیں اور کسی قدر محکم تنظیمی سلسلے بھی۔ لیکن چونکہ ابھی ان کا حلقۂ اثر بہت محدود ہے۔ وہ وسیع ملّی و قومی تقاضوں کا جواب نہیں بن سکتے۔

یہ حالات متقاضی ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کا ہر فرد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے ان کو ادا کرنے کے لئے سرگرمِ عمل ہو جائے اور ان بنیادی کمزوریوں، کمیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کے لئے کوشاں ہو جو عرصہ دراز سے چلی آ رہی ہیں اور اس طرح دین و مذہب، علم و فکر، تعلیم و تربیت، تطہیر اخلاق و عمل، سماجی و معاشرتی اصلاح، قومی و ملی تنظیم غرض ہر میدان میں اصلاح و تعمیر کا عمل تیزی سے شروع ہو جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم بحیثیت ملک و ملت اس وقت موت و زیست کی کشمکش سے دوچار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قدرت کی جانب سے عطا کردہ مہلت ہماری غفلت میں اضافے کا موجب ہو۔ اور پھر قانونِ خداوندی کا کوئی کوڑا ہم پر اچانک برس پڑے!

——— ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخسرین آمین ———

ماخوذ از تذکرہ و تبصرہ مئی ۱۹۶۹ء

افکار و آراء

"یہ غلطی کب تک"

ہفت روزہ 'الجمعیۃ' دہلی، اشاعت ۷ مارچ ۱۹۶۹ء کا اداریہ

پچھلے ہفتہ پاکستانی اخبارات جمہوری مجلس عمل کے لیڈروں کی تصویروں کے ساتھ بھرے ہوئے تھے۔ صدر ایوب نے اپنے مخالف لیڈروں سے غیر مشروط گفتگو کی جو پیشکش کی تھی اس نے راولپنڈی کو چند روز کے لئے تمام پاکستانی لیڈروں کا مرکز بنا دیا۔ کہیں مولانا مودودی مسٹر ایم انور سے مصروف گفتگو ہیں کہیں میاں ممتاز دولتانہ اور خان ولی خاں باہم سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ کہیں مسٹر نور الامین اور خواجہ خیر دین رازدارانہ گفتگو میں مشغول دکھائی دے رہے ہیں۔ کہیں چودھری محمد علی اور نوابزادہ نصر اللہ خاں تبادلہ خیال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آخری وقت آگیا ہے جبکہ پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کیا جانے والا ہو۔

لیڈروں کی یہ سرگرمیاں ان طویل ہنگاموں کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں جن کی مثال پاکستان کی تاریخ میں قبل از تقسیم کے ڈائرکٹ ایکشن کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتی۔ پچھلے چند مہینوں سے پاکستان اپنی زندگی کے انتہائی ہنگامہ خیز دور سے گزرا ہے۔

پاکستان کے لوگوں میں یہ زبردست حرکت کیوں پیدا ہوگئی۔ صرف ایک مقصد کے لئے۔ وہ یہ کہ صدر ایوب کو صدارت کی گدی سے ہٹا دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے موجودہ حالات میں صدر ایوب کو ان کے عہدہ سے ہٹانا ضروری ہو۔ مگر پاکستانی سیاست کے اس بھونچال نے ثابت کیا ہے کہ مسلمان آج بھی اسی لاحاصل جذباتیت میں مبتلا ہیں۔ جہاں وہ سو برس پہلے تھے۔

پاکستان کو بے شمار نہایت اہم مسائل درپیش ہیں۔ مثال کے طور پر تمام مسلم ممالک بشمول پاکستان صنعت اور سائنس میں پیچھے ہونے کی وجہ سے مغربی ممالک کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں ان کی سیاسی آزادی نے انہیں صرف اقتصادی غلامی کے ایک نئے دور سے دوچار کیا ہے۔ اگر پاکستان اس معاملہ میں کم از کم جاپان کی حد تک بھی ترقی کر جائے تو وہ مسلم ممالک کو اقتصادی غلامی سے نجات دلانے کا نقیب بن سکتا ہے۔ اسی طرح آج تمام دنیا ایک پر امن اور عادلانہ سماج کیلئے ترس رہی ہے۔ اگر پاکستان اس معاملہ میں اسلام کا نمونہ بننے کی کوشش کرتا تو وہ موجودہ دنیا میں ایک روشن مینار بن کر کھڑا ہو سکتا تھا۔ اسی طرح دنیا کے بہت سے علاقوں میں مسلمان آبادیاں صرف اس لئے پس رہی ہیں کہ کوئی طاقتور مسلم ملک ان کی پشت پناہی کرنے والا نہیں۔ آج اگر پاکستان اتنا ہی طاقتور ہو جائے جتنا کہ مثال کے طور پر امریکہ ہے تو اس کی صرف ایک گرجدار آواز کتنے علاقوں میں مسلمانوں کی حفاظت اور سالمیت کے لئے کافی ہوگی۔

اسی طرح کے کتنے مسائل ہیں جو پاکستان کی قسمت بن کر اس کے اوپر لٹک رہے ہیں مگر ان میں سے کسی مسئلہ پر پاکستانی عوام یا پاکستانی لیڈروں اور پیشواؤں میں کوئی حرکت پیدا نہ ہو سکی البتہ ایوب کو صدارت سے ہٹانے کے لئے اتنا

زبردست طوفان برپا ہے کہ گویا ایوب ہٹے نہیں کہ پاکستان جنت نظیر بن گیا۔

افسوس کہ ہم طویل ترین مدت سے ایک ہی غلطی میں مبتلا ہیں۔ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ سیاسی تبدیلیاں ساری تبدیلیوں اور کامیابیوں کا دروازہ ہے اور اگرچہ تجربات نے اس طریقہ کی غلطی آخری حد تک واضح کر دی ہے مگر اس معاملہ میں ہمارا ذہن کسی طرح بدلنے کا نام نہیں لیتا۔

انگریز کے سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے ہم نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ہمارے تمام اصاغر و اکابر سمجھ بیٹھے تھے کہ انگریز کے ہٹتے ہی اسلام کی روایتی عظمت و شوکت کا دور دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ انگریز نے سیاسی گدی چھوڑ دی اور اس واقعہ پر تقریباً چوتھائی صدی گزر گئی مگر ہمارا کوئی ایک مسئلہ بھی حل نہ ہوا بلکہ شدید تر ہو گیا۔

اس سنگین تجربہ کا کم سے کم فائدہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ہم سیاسی تبدیلیوں کا بے حقیقت ہونا سمجھ جاتے۔ اور یہ جان لیتے کہ زندگی اور تقدیر بنانے میں کچھ دوسرے عوامل زیادہ اہم حصہ ادا کرتے ہیں۔ مگر افسوس کہ سب کچھ کھونے کے باوجود ہمیں یہ فائدہ بھی حاصل نہ ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی لیڈروں کی موجودہ سرگرمیاں اور گفت و شنید کی دوڑ دھوپ طفلانہ ہنگاموں سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ صدر ایوب کو ان کے سیاسی عہدے سے ہٹا دینا کسی بھی درجہ میں پاکستان کے کسی مسئلہ کا حل نہیں ہے۔

پاکستانی لیڈروں کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ پاکستان میں ایک اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ قوم وجود میں لاتے۔ اس کو ایک مضبوط ملک بناتے مگر اس مشکل کام کی تاب وہاں کے کسی لیڈر میں نہیں تھی اس لئے انہوں نے اس آسان راستہ کو اپنا لیا کہ دوسروں کے خلاف سیاسی ہنگامے برپا کر کے اپنی اہمیت کا مظاہرہ کریں۔ مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں۔ کہ آج کے لحاظ سے خواہ پاکستانی عوام کو ان کے نعرے کتنے ہی پُر امید نظر آتے ہوں مگر مستقبل کے اعتبار سے ان نعروں میں پاکستان کے لئے کچھ نہیں ہے۔ مستقبل کی تعمیر کے لئے قوم و ملک کو بدلنے کی ضرورت ہے نہ کہ سیاسی عہدوں کو بدلنے کی۔

پاکستانی سیاست ایک اہم موڑ پر

—— : ماہنامہ 'معارف' اعظم گڈھ، اپریل ۱۹۶۹ء کا اداریہ : ——

از قلم شاہ معین الدین احمد ندوی

[برِ صغیر ہند و پاک کا کون سا پڑھا لکھا مسلمان ہوگا جو مجلس دارالمصنفین، اعظم گڑھ، یو پی، انڈیا کے ماہوار علمی مجلہ 'معارف' کے نام سے واقف نہ ہو۔ اس علمی جریدے کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۶۹ء میں اس کے فاضل مدیر شاہ معین الدین احمد ندوی نے پاکستان کی موجودہ صورت حال پر اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ اگرچہ کسی تحریر کے جملہ مشتملات سے کلی اتفاق تو شاذ ہی ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ تحریر

بحیثیت مجموعی اس قابل ہے کہ پاکستان کا ہر درد مند مسلمان اسے پڑھے اور اس کی روشنی میں اپنے گرد و پیش کے حالات کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرے ——— اسرار احمد]

• پاکستان کا انقلاب مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشی بلکہ بدبختی کا نمونہ ہے۔ دوسرے اسلامی ملکوں کو ان کے دشمنوں کے ہاتھوں جو نقصان پہنچا ہے اس انقلاب نے پاکستان کو اس سے کم نقصان نہیں پہنچایا۔ جنرل ایوب خاں میں ضرور خامیاں ہوں گی ورنہ ان کے خلاف اتنا بڑا انقلاب نہ ہوتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان ہی نے پاکستان کو آتے دن کے انقلاب سے نجات دلائی۔ اس کو استحکام بخشا۔ بیرونی دنیا میں اس کی ساکھ قائم کی اور مختلف حیثیتوں سے اس کو بڑی ترقی دی۔ ان ساری ترقیوں کو موجودہ انقلاب نے برباد کر کے رکھ دیا جس کی تلافی مدتوں میں ہوسکے گی۔ یہ بھی ایوب خاں کا تدبر ہے کہ فوجی جنرل ہوتے ہوئے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیا اور مخالفین کے بنیادی مطالبات مان لئے ورنہ اس سے بھی زیادہ کشت و خون ہوتا۔

ان کے مخالفین نے عوام کے جذبات تو ابھار دیئے لیکن ان کو قابو میں نہ رکھ سکے اور ان میں ایسا جنون پیدا ہوگیا کہ پورے پاکستان میں غدر کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ خصوصاً مشرقی پاکستان کے ناعاقبت اندیش عوام نے خود اپنے بھائیوں پر ایسے وحشیانہ مظالم کئے جن سے روس اور فرانس کے انقلاب کی یاد تازہ ہوگئی۔ اور یہ کارِ خیر اس امت کے ہاتھوں انجام پایا جو ساری دنیا کے لئے امن و سلامتی کا پیام لاتی تھی۔ اب جمہوریت اور سوشلزم کے علمبرداروں کو بھی اس کا اندازہ ہوگیا ہے کہ انہوں نے جس آتش فشاں کو بھڑکایا تھا۔ وہ پورے پاکستان کو جلا کر خاکستر کر دے گا۔ جمہوریت اور سوشلزم کا نعرہ محض ایوب خاں کی مخالفت تک محدود نہیں رہ گیا بلکہ اس نے نسلی، جغرافی، لسانی ہر قسم کی عصبیتوں اور دوسرے فاسد عناصر کو ابھار دیا ہے۔ اگر ان سب کے مطالبات مان لئے جائیں تو پاکستان کا وجود باقی نہ رہے گا۔

عوامی جمہوریت یعنی برطانوی طرز کی پارلیمانی حکومت اور سوشلزم تو خود یورپ کے سب ملکوں میں نہیں ہے بلکہ اس کی شکلیں ہر ملک کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ یہ نظامِ حکومت ان ہی ترقی یافتہ ملکوں کے لئے مفید ہے جن کا سیاسی شعور پختہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان جیسے غیر تعلیم یافتہ اور پسماندہ ملکوں کے لئے انتہائی مہلک ہے اسی لئے یہ جمہوریت ایشیا کے کسی ملک میں بھی کامیاب نہیں۔ ہندوستان میں اس کی کامیابی کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے مگر اس کی کامیابی ملک کی موجودہ بدنظمی اور انتشار سے ظاہر ہے۔ اسی لئے اب ہندوستان کے بہت سے مفکرین اس کے خلاف ہو رہے ہیں۔ اس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ یورپ خصوصاً برطانیہ صدیوں کے علم و تجربہ کے بعد جس منزل پر پہنچا ہے، ہندوستان و پاکستان چند برسوں میں وہاں تک پہنچنا چاہتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ شیر خوار بچہ کو ثقیل غذائیں کھلائی جائیں۔ اس کا نتیجہ ہلاکت کے سوا کیا نکل سکتا ہے۔ ہم اس جمہوریت اور سوشلزم کے خلاف نہیں ہیں، لیکن وہ پاکستان جیسے نومولود ملک کے لئے قطعاً موزوں نہیں ہے۔ اس کے لئے محدود جمہوریت کے ساتھ اچھا صدارتی نظام ہی مناسب ہے، پھر رفتہ رفتہ اس کو وسیع جمہوریت کی طرف بڑھایا جائے ورنہ اس کے جو تلخ نتائج ایک مرتبہ نکل چکے ہیں وہی آئندہ بھی نکلیں گے۔ لیکن اگر پاکستان کی فلاح اسی میں ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد۔

لطف یہ ہے کہ اس جمہوریت اور سوشلزم کو اسلام کے لبادے میں پیش کیا جاتا ہے جو سراسر فریب ہے۔ اسلام کا اپنا مستقل نظام ہے جو ان سب سے مختلف ہے۔ ان کی خوبیوں سے پاک لیکن ان کے صالح عناصر کا جامع ہے۔ اس معنی میں اسلام کا نظام بلاشبہ جمہوری ہے کہ اس میں مطلق العنان آمریت نہیں اور امیر یا حکمران کے انتخاب اور دوسرے اہم معاملات میں اصحاب رائے کا شوریٰ ضروری ہے لیکن بالغ رائے دہندگی نہیں۔ اسی طرح ملکی حقوق میں ملک کے سارے باشندے برابر ہیں لیکن اشخاص کے لئے جائز طریقوں سے حصول دولت پر کوئی پابندی نہیں اور مذہب کے مقرر کردہ صدقات اور حکومت کے عائد کردہ ٹیکس کی ادائیگی کے بعد ہر شخص اپنی دولت کا مالک رہے گا۔ وہ حکومت کی ملک نہیں بن سکتی۔ درحقیقت اسلام کا مالی اور معاشی نظام اتنا موزوں ہے اور اس نے دولت مندوں پر اتنے قرائض عائد کر دیئے ہیں کہ اگر ان سب پر عمل کیا جائے تو ملک میں نہ مفرط سرمایہ داری پیدا ہو سکتی ہے اور نہ غربت و افلاس۔ حیرت ان علماء پر ہے جو اسلامی نظام کی دعوت کے باوجود ان ہی گمراہ کن اصطلاحوں کے پیچھے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

اس وقت ساری دنیا میں کمیونزم، جمہوریت اور سرمایہ داری کی ٹکر ہے۔ اور ان میں ہر فریق ایشیا اور افریقہ میں اپنا اثر قائم کرنے کے لئے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ پاکستان کا انقلاب بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان میں تو کمیونزم کے اثرات بالکل نمایاں ہیں، وہاں مہاجرین کے خلاف بھی تعصب پیدا ہو گیا ہے۔ یہ کس قدر شرم اور افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستان میں جہاں دینی اخوت کا کوئی تصور نہیں، شرنارتھی اپنے پرانے وطن کی طرح سکون اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور پاکستان میں جس کی بنیاد اسلام کے نام پر قائم ہوتی ہے ان دینی بھائیوں کو جن کی قربانیوں کے بدولت پاکستان بنا ہے غیر سمجھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ افسوسناک بات تصور میں نہیں آ سکتی۔

پاکستان میں نسلی اعتبار سے مختلف قومیں آباد ہیں۔ جن کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ ان میں وحدت کا رشتہ صرف اسلام ہے۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹا تو پھر اس کو کوئی قوت انتشار سے نہیں بچا سکتی۔ موجودہ انقلاب نے اس کی اہمیت اور زیادہ واضح کر دی ہے۔ اس وقت پاکستان میں نہ صرف ہر صوبہ اور ہر نسل بلکہ ہر طبقہ مطالبات کی ایک طویل فہرست لے کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اگر ان کو مان لیا جائے تو پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور وہ سیاسی حیثیت سے دیوالیہ ہو جائے گا۔ اس کی بقا و استحکام زیادہ سے زیادہ وحدت اور ایک مضبوط مرکزی حکومت پر موقوف ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ صوبوں خصوصاً مشرقی پاکستان کی جائز شکایتوں کا ازالہ بھی ضروری ہے اور ایسا حل نکالنے کی ضرورت ہے جس سے پاکستان کی وحدت بھی قائم رہے اور صوبوں کی شکایتیں بھی دور ہو جائیں۔ ورنہ اگر ہر فریق اپنے مطالبات پر اڑا رہا تو پاکستان کی تباہی کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ مشرقی پاکستان تو یقیناً کمیونزم کی گود میں چلا جائے گا اور اس کے نتائج کا اس وقت اس کو اندازہ ہو گا جب اس کی نظافی کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی۔ اس لئے اس وقت ایوب کے مخالفین اور جمہوریت و سوشلزم کے علمبرداروں کے تدبر کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا ان کو اپنا بھلا برا سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور پاکستان کو ہر گزند سے محفوظ رکھے۔"

Coca-Cola
Coca-Cola is it!
TRADE-MARK REGD.
paragon

الہدیٰ

نشست ۲۵

اثباتِ آخرت

سورۂ قیامہ کی روشنی میں

(درسِ ہشتم)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ٹیلیویژن کے دروس کا سلسلہ

(۲)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ﴿١﴾ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ ﴿٢﴾ اَیَحْسَبُ
الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَہٗ ﴿٣﴾ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ
بَنَانَہٗ ﴿٤﴾ بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَہٗ ﴿٥﴾ یَسْـَٔلُ اَیَّانَ یَوْمُ
الْقِیٰمَۃِ ﴿٦﴾ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿٧﴾ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿٨﴾ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَ
الْقَمَرُ ﴿٩﴾ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ﴿١٠﴾ کَلَّا لَا وَزَرَ ﴿١١﴾ اِلٰی
رَبِّکَ یَوْمَئِذِ نِ الْمُسْتَقَرُّ ﴿١٢﴾ یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴿١٣﴾
بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ﴿١٤﴾ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ ﴿١٥﴾ لَا تُحَرِّکْ

بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ
فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾
وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾
وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾ كَلَّآ اِذَا
بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ وَ
الْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨ الْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾ فَلَا صَدَّقَ
وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾
اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ
يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ
عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾
اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾

"نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی — اور نہیں! مجھے قسم ہے نفس ملامت گر کی — کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے ہ — کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اس کی ایک ایک پور کو ٹھیک ٹھاک اور برابر کر دیں — اصل بات یہ ہے کہ انسان اپنے فسق و فجور کو جاری رکھنا چاہتا ہے — پوچھتا ہے کب ہو گا قیامت کا دن ہ — تو جب نگاہ چندھیا جائے گی — اور چاند بے نور ہو جائے گا — اور سورج اور چاند یک جا کر دیئے جائیں گے — تو اُس دن کہے گا یہی انسان کہ کہاں ہے بھاگ جانے کی جگہ ہ — کوئی نہیں! کہیں ٹھکانا نہیں! — اس روز تو تیرے رب ہی کی طرف جا ٹھہرنا ہے — اس روز جتلا دیا جائے گا ہر انسان کو ہر اس چیز سے جو اُس نے آگے بھیجی اور جو کچھ پیچھے چھوڑی — بلکہ انسان خود اپنے بارے میں پورے طور سے

آگاہ ہے — خواہ وہ کتنے ہی بہانے بنائے —— اے نبیؐ! آپ اس قرآن کے ساتھ تیزی سے اپنی زبان کو حرکت مت دیجئے کہ اسے جلدی سے حاصل کرلیں — تحقیق ہمارے ذمے ہے اس کو جمع کرنا بھی اور اسکو پڑھوانا بھی —— پس جب ہم پڑھوائیں تو آپ اس پڑھنے کی پیروی کیجئے — پھر بلاشبہ ہمارے ہی ذمے ہے اس کی مزید تشریح بھی اور توضیح بھی — کوئی نہیں! بلکہ تم لوگ دُنیا کی محبت میں گرفتار ہو — اور آخرت کو نظر انداز کر دیتے ہو — بہت سے چہرے اُس دن تروتازہ ہوں گے — اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوئے —— اور بہت سے چہرے اُس دن سوکھے ہوئے اداس ہوں گے — یہ گمان کر رہے ہوں گے! کہ اب ان کے ساتھ کمر توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے — کوئی نہیں! جب جان ہنسلیوں میں آپھنسے گی — اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا — ع اور انسان یہ سمجھ لے گا کہ اب دنیا سے جدائی کا وقت آگیا ہے — اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی — اور اس روز تیرے رب ہی کی طرف ہانکے جانا ہے — پس نہ اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی — بلکہ جھٹلایا اور پیٹھ موڑ لی — اور چل دیا اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا اینڈھتا ہوا — افسوس ہے تجھ پر پس افسوس ہے تجھ پر — پھر افسوس ہے تجھ پر، پس پھر افسوس ہے تجھ پر — کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ — کیا نہیں تھا وہ منی کی ایک بوند جو ٹپکائی گئی — پھر وہ تھا ایک لوتھڑا جسے اللہ نے بنایا اور سنوارا — پھر اُسی میں سے بنا دیئے جوڑے نر اور مادہ — کیا وہ ہستی اس پر قادر نہیں! کہ مُردے کو زندہ کر سکے؟"

"یقیناً اے ہمارے رب! تو اس پر قادر ہے اور ہم اس پر گواہ ہیں"۔

اور "سچ فرمایا ہمارے آقا عظمت والے اللہ نے"۔

معزز حاضرین اور محترم ناظرین!

یہ ہے سورہ قیامہ اور یہ ہے اس کی کسی حد تک ترجمانی جو آپ کے سامنے آئی - اس سورۂ مبارکہ کا جو ایک مجموعی تاثر ہے اور اس کے جو مضامین ہیں، اس ترجمانی سے ان کا ایک اجمالی نقشہ ہمارے سامنے آگیا ہے — اس سورہ مبارکہ کے مطالب و مفاہیم پر قدرے گہرائی میں اتر کر غور کرنے سے قبل میں یہ چاہتا ہوں کہ اس سورۂ مبارکہ کے حوالے سے دو باتیں آپ اچھی طرح سمجھ لیں — اور یہ دونوں باتیں فہم قرآن کے ضمن میں بنیادی کلیدوں کی حیثیت رکھتی ہیں -

سب سے پہلی بات قرآن مجید کے اسلوب سے متعلق ہے — یہ بات جان لیجئے کہ قرآن حکیم ہماری عام تصانیف کے مانند کوئی تصنیف نہیں ہے - ہماری اپنی تصانیف اور تالیفات کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے - اس کی ایک اپنی ترتیب اور اپنی ایک نہج ہوتی ہے — اس میں ابواب ہوتے ہیں - ایک باب میں مضمون کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے - پھر اس کو اگلے باب میں دوہرایا نہیں جاتا - جو لوگ قرآن حکیم کو دنیا کی عام تصنیفات و تالیفات پر قیاس کر کے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں ناکامی بھی ہوتی ہے اور بے دلی بھی ہوتی ہے — اچھی طرح جان لیجئے کہ قرآن حکیم نہ عام تصانیف و تالیفات کے مانند ہے اور نہ ہی اس کی سورتوں کی حیثیت کتاب کے ابواب کی ہے یا مضامین یا مقالات کی ہے - بلکہ قرآن حکیم کا اسلوب ہے خطبے کا — اور قرآن حکیم کی سورتیں گویا کہ خطباتِ الٰہیہ ہیں — لہٰذا قرآن مجید کو آپ مجموعۂ خطباتِ الٰہیہ سے تعبیر کر سکتے ہیں — اب خطبے کے اسلوب میں چند چیزیں ایسی ہیں جو اس کے لازمی جزو کی حیثیت کی حامل ہیں - ان کو سمجھ لیا جائے تو قرآن مجید کے فہم میں بڑی آسانی ہو جائے گی —

پہلی بات یہ کہ جب کوئی شعلہ بیان خطیب کوئی خطبہ دے رہا ہو تو ایک

نمایاں بات تو یہ سامنے آتے گی کہ اس میں بار بار خطاب کا رخ بدلے گا۔ ابھی وہ داہنی طرف مخاطب تھا اور گفتگو کر رہا تھا۔ پھر وہ باہنی جانب کے لوگوں کی طرف مخاطب ہو گیا، اب ان سے گفتگو کر رہا ہے۔ اکثر اس کے مخاطبین اس کے سامنے بیٹھے ہوتے لوگ ہوتے ہیں — کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ موجود نہیں ہوتے ان کو وہ موجود اور حاضر فرض کر کے اُن سے گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ حاضرین سے گفتگو کر رہا ہوتا ہے لیکن صیغۂ خطاب میں نہیں بلکہ صیغۂ غائب کے انداز میں۔ گویا وہ اس وقت وہاں موجود نہیں ہیں — پھر آپ خطبات میں یہ بھی دیکھیں گے کہ جو مخاطبین ہیں، ان کے اعتراضات کو نقل کئے بغیر اور ان کے سوالات کو بیان کئے بغیر ان کا جواب دیا جاتا ہے۔ جواب کا انداز و اسلوب ایسا ہوتا ہے کہ حاضرین و مخاطبین خود جان لیں کہ یہ بات فلاں اعتراض کے جواب میں کہی جا رہی ہے۔ یہ تشریح فلاں سوال کے طور پر آئی ہے۔ یہی انداز آپ کو قرآن مجید میں ملے گا۔ اگر خطبہ کے اسلوب اور انداز کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو فہم قرآن میں بڑی مدد ملتی ہے۔

اس سورہ مبارکہ میں آپ دیکھیں گے کہ یہ اسلوب خطابت اور خطبہ کا یہ انداز بہت نمایاں ہے۔ ساری گفتگو منکرین قیامت سے ہو رہی ہے۔ کبھی صیغہ حاضر و خطاب میں براہِ راست ان سے بات ہو رہی ہے۔ کبھی الانسان کے حوالے سے بصیغہ غائب گفتگو ہو رہی ہے۔ درمیان میں چند باتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے فرما دی گئیں۔ اس طرح تحویل خطاب ہو گیا۔ پھر خطاب کا رُخ دوبارہ منکرین قیامت و آخرت کی طرف منتقل ہو گیا۔ تو تحویل خطابت اور خطبہ کا یہ جو اسلوب و انداز ہے، اس کے اعتبار سے یہ سورہ مبارکہ اس کا ایک نمایاں نمونہ ہے۔

دوسری بات یہ کہ ابتدائی مکی سورتوں کا اپنا ایک خاص الخاص اسلوب و انداز ہے — مکی دور کے بھی آخری حصے میں جو سورتیں نازل ہوئی ہیں، ان کا اسلوب

کچھ مختلف ہے — پھر مدنی سورتوں میں جا کر وہ جو رنگِ دگر ہے وہ پختہ اور بہت نمایاں ہو جاتا ہے — ابتدائی مکّیات اور بعد کی سورتوں کے مابین جو فرق ہے ان کو یوں سمجھئے کہ ابتدائی مکّی سورتوں میں خطابت کا رنگ بہت زیادہ گہرا اور بہت نمایاں ہے — ان میں جوش و خروش بھی زیادہ ہے جیسا کہ آپ نے اس سورہ مبارکہ میں محسوس کیا ہوگا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شعلہ بیان خطیب خطبہ دے رہا ہے۔

— پھر یہ کہ ابتدائی مکّی سورتوں میں آیات چھوٹی چھوٹی ہیں — بعد کی سورتوں بالخصوص مدنی سورتوں میں آیات کا حجم بڑھ گیا ہے — چنانچہ ہم ایک فوری تقابل کر سکتے ہیں — یہ سورہ قیامہ ہے، جو ابتدائی مکّی سورتوں میں سے ایک ہے اس سے متصلاً قبل ہم نے سورۂ تغابن کا مطالعہ کیا ہے جو مدنی سورہ ہے — وہ بھی دو رکوعوں پر مشتمل ہے — اور یہ سورہ قیامہ بھی دو رکوعوں پر مشتمل ہے مصحف میں اگر ان دونوں سورتوں کے حجم کا آپ تقابل کریں گے تو سورہ قیامہ، سورہ تغابن کے تین چوتھائی سے بھی کم ہے — لیکن اس کی آیات کی تعداد اٹھارہ ہے، اس کی آیات کی تعداد چالیس ہے — پھر آپ دیکھیں گے کہ ابتدائی مکّی اکثر سورتوں میں موزونیت اور ترنّم ہے، Rhythm ہے — روانی ہے، Flow ہے — روانی بھی بلا کی ہے اور جوش و خروش بھی بے پناہ ہے — اُن میں آپ کو یہ رنگ بھی غالب نظر آئے گا کہ صوتی آہنگ کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے — قوافی ہیں اور عموماً آیات کے آخری الفاظ کے مابین ایک صوتی مناسبت ہے — یہ تمام اوصاف ابتدائی مکّی سورتوں میں بہت نمایاں ہیں جبکہ آخری دور کی مکّیات اور بالخصوص مدنی سورتوں میں آپ اس کے برعکس کیفیت دیکھیں گے — آیات طویل ہو گئی ہیں، بہاؤ تیز نہیں ہے بلکہ بڑے پُرسکون انداز میں جیسے کہ کوئی دریا بہہ رہا ہو اس طرح مضمون بہتا اور آگے بڑھتا ہے — ان میں قوافی کا بھی اُتنا اور ویسا اہتمام نہیں ہے جو ابتدائی مکّیات کا خصوصی وصف نظر آتا ہے — اس تقابل کو اگر آپ ایک تشبیہ سے سمجھنا چاہیں تو بڑی پیاری تشبیہ

ہے ۔ ایک تو ہوتے ہیں پہاڑی ندی اور نالے ۔ ایک ہوتے ہیں میدانی دریا۔ آپ کو معلوم ہے کہ پہاڑی نالے اور ندیوں کے پاٹ بہت ہی کم ہوتے ہیں ۔ عموماً چوڑائی کم اور گہرائی زیادہ ہوتی ہے ۔ البتہ بہاؤ میں نہایت تیزی اور اور جوش وخروش ہوتا ہے ۔ جبکہ یہی ندیاں اور نالے جب کسی دریا میں آکر ملتے ہیں اور وہ دریا میدان میں آتا ہے تو اس کا پاٹ بہت چوڑا ہو جاتا ہے ۔ گہرائی اتنی نہیں رہتی ۔ پھر یہ کہ میدانی دریا بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ، بڑے سکون کے ساتھ ، یکسانی اور ہمواری کی سی کیفیت کے ساتھ، تسلسل کے ساتھ رواں رہتا ہے ۔ تو ابتدائی مکیات کو پہاڑی ندی نالوں کے سے جوش وخروش اور آخری دور کی مکیات پھر مدنیات کو ایک ہموار اور یکسانیت کے ساتھ بہنے والے میدانی دریا سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے ۔ لہٰذا ابتدائی مکیات پھر آخری مکیات نیز مدنی سورتوں کے اسلوب کے مابین جو فرق وتفاوت ہے اس کو اس تشبیہہ پھر بالخصوص سورۂ قیامہ کے حوالے سے آپ اچھی طرح ذہن نشین کر سکتے ہیں ۔

اس سورہ مبارکہ کا آغاز دو قسموں سے ہوتا ہے ۔ پھر ان دونوں قسموں سے پہلے حرف " لا " آیا ہے ۔ یہاں یہ بات اچھی طرح جان لیجئے کہ لَآ اُقْسِمُ میں" لَآ اُقْسِمُ سے متصل نہیں سمجھا جائیگا" بلکہ لا منفصل ہے" لا علیحدہ ہے" "اُقْسِمُ علیحدہ ہے ۔لیکن چونکہ عربی زبان میں انگریزی کی طرح کے 'Punctuations' یعنی علامتیں اور اوقاف نہیں ہیں ۔ لہٰذا یہ فرق اسلوب بیان سے اور مضمون کے سیاق وسباق پر غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے ۔ ایک خطیب خطبہ شروع کرتا ہے تو اس کے سامنے اس کے جو سامعین ومخاطبین ہیں، ان کے ذہنوں میں کچھ اشکالات ہیں، اعتراضات ہیں، سوالات ہیں ۔لہٰذا خطیب انکی تردید سے اپنی گفتگو شروع کرتا ہے اور کہتا ہے: "لا" ہرگز نہیں! تمہارے خیالات غلط ہیں، تمہارے اشکالات باطل ہیں، تمہارے اعتراضات بے وزن ہیں: اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ۔ "میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی"۔ ۔۔ گویا قیامت اتنی یقینی حتمی اور قطعی ہے کہ میں اسکی قسم کھا رہا ہوں ۔اسی طرح انگریزی میں NAY کا استعمال ہوتا ہے ۔ لہٰذا اس آیت کو انگریزی میں یوں ادا کیا جائے گا:

'Nay! I swear by the Day of Judgement'

اب یہاں   کے بعد ایک   (کوما ء د) آجاتا ہے جس سے بات واضح ہوجاتی ہے - آپ یہاں اسی "کوما" کو محذوف سمجھیے، مقدر جانیے، سمجھیے - پھر آیت کو پڑھیے : لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ - "وہ نہیں! - میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی"۔ اسی طرح دوسری آیت : وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ہ "نہیں! - میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی"۔ یہ آغاز خود بتا رہا ہے کہ انداز و اسلوب خطیبانہ ہے جیسے کہ ایک خطیب ہے جو اپنا خطبہ شروع کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کے سامنے جو سامعین، حاضرین اور اسکے مخاطبین ہیں ان کے ذہنوں میں کیا کیا وسوسے ہیں! کیا کیا اشکالات ہیں! کیا کیا اعتراضات ہیں! کیا خیالات ہیں! وہ کن کن وجوہ اور اسباب کی بنیادوں پر وقوعِ قیامت و آخرت کو بالکل ناممکن سمجھ رہے ہیں! محال جان رہے ہیں!" — وہ کن کن طریقوں سے اس بات کا انکار کر رہے ہیں - لہذا خطیب اُن کے ان تمام اشکالات، اعتراضات اور وسوسوں کی نفی سے اپنے خطبے کا آغاز کر رہا ہے : لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ہ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ہ

اب ہمیں اس بات کو سمجھنا ہے کہ ان قسموں سے مراد کیا ہے! ان کا اصل مفاد و فائدہ کیا ہے! - اور ان میں اللہ تعالیٰ نے اثباتِ قیامت و آخرت کے لیے مثبت استدلال کو جس طرح کوزے میں دریا کو بند کرنے کا محاورہ ہے عین اس کے مطابق ان قسموں کے اسلوب میں کس طرح جامعیت اور حد درجہ ایجاز و اعجاز کے ساتھ تمام اشکالات و اعتراضات کے جواب کو سمو دیا ہے! اس پر ان شاء اللہ تعالیٰ تفصیلی گفتگو اگلی نشست میں ہوگی — آج اس سورۂ مبارکہ کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا - اس ضمن میں اگر کوئی سوال یا اشکال ہو تو میں حاضر ہوں -

سوال و جواب

سوال : ڈاکٹر صاحب! یہ جو قرآن مجید کا ٹھیٹھ عربی انداز ہے، اس کی اہمیت آج کل کی جو عربی ہے اس میں کس حد تک ہے؟

جواب : مناسب سوال ہے - عربی زبان پر قرآن مجید کا ایک بہت بڑا احسان

یہ ہے کہ عربی کی ادبی زبان کی روایات کا جو قدیم تسلسل ہے تو گویا ایک ستون کی طرح قرآن مجید عربی زبان کی ان ادبی روایات کو تھامے ہوئے ہے۔ اب بھی عربی ادب میں قرآن مجید کا مقام وہی ہے جو اس کے نزول کے وقت تھا۔ پھر عربی کو بحیثیت مادری زبان رکھنے والے معتد بہ یہودی اور عیسائی اب بھی موجود ہیں۔ وہ اگرچہ قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان نہیں رکھتے لیکن وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فصاحت و بلاغت اور ادبیت و سلاست کی معراج ہے قرآن مجید ۔ قرآن حکیم کے ان اوصاف میں سے کسی کے بارے میں بھی ان کو کوئی اشتباہ نہیں ہے، ۔ یہ بات اپنی جگہ زیادہ تفصیل طلب بلکہ ایک علیحدہ وسیع موضوع ہے کہ قرآن مجید کے اعجاز کے کون کون سے رُخ ہیں، کون کون سے پہلو ہیں! لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کے معانی، اس کے مفاہیم، اس کا طرزِ استدلال، اسکی رہنمائی، اس کی رُوحانی و اخلاقی تعلیمات۔ پھر انسان کی عمرانی اور تمدنی زندگی کے مسائل کا خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، ان کا جو متوازن اور صحیح حل قرآن پیش کرتا ہے، وہ سب اپنی جگہ معجزے ہیں لیکن اس کے نزول کے وقت اسکی جو فوری طور پر سب سے زیادہ تاثیر محسوس ہوئی تھی وہ اس کا اسلوب بیان ہے۔ اس کی ادبیت، اسکی فصاحت۔ اسکی بلاغت، اس کی سلاست، اس کی حلاوت، اس کی چاشنی ہے۔ اور وہ تاحال اُسی طرح آفتاب عالم تاب کی مانند قائم۔ باقی اور تابندہ ہے اس پر کہیں بھی فرسودگی، بوسیدگی باسی یا پرانے پن کا کوئی اثر نہیں ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کتاب ہے، کہ: وَلَا یَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا یَخْلُوْ عَنْ کَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ ۔ "وہ علماء اس کتاب سے کبھی سیر نہیں ہونگے اس پر باسی پن کبھی طاری نہیں ہوگا نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات یعنی نئے نئے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم ہوگا"۔ گویا یہ ہمیشہ تر و تازہ کلام رہے گا جیسا کہ اپنے نزول کے وقت تھا۔

سوال : ڈاکٹر صاحب! آپ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں عام دنیوی کتابوں کی طرح Parts یا Chapters نہیں ہیں۔ لیکن ہم نے سنا ہے کہ

جب وحی نازل ہوتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو آیت یا آیتیں ہیں، ان کو فلاں سورت کے ساتھ یا فلاں آیات کے بعد شامل کرلو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے کچھ Parts یا اس کی کوئی تقسیم ضرور ہے۔ اس بارے میں آپکا کیا خیال ہے ؟ -

جواب : بہت عمدہ سوال ہے — اس میں کچھ شک نہیں کہ قرآن مجید کا اپنا ایک اندرونی نظام ہے - ہر سورت کا ایک مرکزی خیال ہے، اس کا عمود ہے۔ جس کے ساتھ اس کی آیات متعلق ہیں - لہذا ترتیب نزول میں اگرچہ کچھ فرق ہوتا تھا لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ترتیب مصحف میں اس معنوی ربط و تعلق کو مدنظر رکھتے ہوئے آیات و سور ترتیب فرماتے تھے - البتہ یہ بات جان لیجئے۔ کہ یہ کام بھی اللہ تعالےٰ کی ہدایت کے مطابق انجام دیا جاتا تھا جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے آپؐ کو دی جاتی تھی — البتہ میں نے جو بات عرض کی تھی وہ یہ کہ قرآن مجید کا یہ اندرونی نظام اور اسکی ترتیب ہماری جو دنیوی تصانیف و تالیفات ہیں ان کے chapters کے مانند نہیں ہیں۔ قرآن مجید کا اپنا ایک منفرد انداز ہے - اس کا اپنا ایک Unique اسلوب ہے۔ اس کو اپنے مقام پر رکھ کر اگر غور کیا جائے اور سمجھا جائے تو اس نظام میں ہمیں بہت سی حکمتیں نظر آئیں گی - اگر ہم ان پر دنیوی تصانیف کے chapters پر قیاس کرکے غور کریں گے تو ہمیں دقتیں بھی محسوس ہونگی اور ہم قرآن مجید سے صحیح طور پر استفادہ سے محروم رہ جائیں گے -

حضرات ! آج ہم نے اس سورہ مبارکہ کے حوالے سے قرآن مجید کے بارے میں چند بڑی بنیادی باتیں سمجھی ہیں - ان کو اگر آپ ذہن نشین کرلیں گے تو مطالعہ اور فہم قرآن حکیم کے لئے ان شاء اللہ تعالےٰ یہ باتیں بہت مفید ثابت ہوگی - البتہ سورہ قیامہ پر غور و فکر کا سلسلہ ابھی پوری طرح شروع نہیں ہو سکا ہے - ان شاء اللہ العزیز وہ ہم آئندہ نشست میں شروع کرینگے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین -

اسلامی انقلاب : مراحل، مدارج اور لوازم (خطاب ۴)

صبرِ محض سے اقدام تک

امیرِ تنظیمِ اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد، کا سلسلہ وار خطاب

حضرات! آج ہمیں سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ایک نہایت اہم اور حد درجہ غیر معروف باب (Chapter) کا مطالعہ کرنا ہے۔ جس کا عنوان یہ ہے کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدوجہد میں صبرِ محض، یعنی (Passive Resistance) سے 'اقدام' (یعنی Active Resistance) کی طرف پیشقدمی کا مرحلہ کب اور کیسے آیا؟ اس ضمن میں سب سے پہلے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ چونکہ ہر اجتماع میں اس بات کا امکان رہتا ہے کہ کچھ اصحاب بالکل نئے ہوں۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان اجتماعاتِ جمعہ میں جو سلسلۂ گفتگو گذشتہ دو ماہ سے چل رہا ہے اس کی طرف ایک اجمالی اشارہ کر دیا جائے۔[1]

گذشتہ مباحث کا خلاصہ اور ربطِ مضمون ہم آج کل سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ خاص اس پہلو سے کر رہے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عظیم انقلاب برپا فرمایا وہ کن کن مراحل سے ہو کر گزرا تھا! اس کے ابتدائی، درمیانی اور اختتامی مراحل کون کون سے تھے اور پھر یہ کہ اس انقلاب میں کس طرح درجہ بدرجہ ایک مرحلے سے دوسرے کی جانب پیش رفت ہوئی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس ضمن میں 'انقلابِ نبوی' پر گفتگو سے قبل میں نے مجرّد انقلاب کے موضوع پر مفصل گفتگو کی تھی کہ کوئی بھی انقلاب جو حقیقی معنوں میں انقلاب ہو اور جو واقعتاً انسان کی اجتماعی زندگی کے کسی گوشے میں ایک بنیادی تبدیلی پر منتج ہوا ہو، ایسے انقلاب کا طریقِ کار (Methodology) کیا ہوتا ہے ـــــ ساتھ ہی میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اس ضمن میں میرا ماخذ (Source) صرف اور صرف سیرت النبی ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) البتہ میں نے ابتداءً اسے سیرتِ مطہرہ سے علیحدہ کرتے ہوئے مجرّد انداز میں بیان کیا تھا ـــــ ذہن میں پھر تازہ کر لیجیے کہ کسی بھی انقلاب کے چھ مراحل ناگزیر ہیں۔ تین مراحل تمہیدی نوعیت کے ہیں اور تین کو ہم

---

[1] تفصیلات کے لئے ماہنامہ میثاق کے شمارہ کے جنوری، مئی، جون، جولائی اور اگست کے شمارے ملاحظہ فرمائیے

تکمیلی مراحل قرار دے سکتے ہیں ـــــ تمہیدی مراحل میں پہلا مرحلہ یہ ہے کہ کوئی انقلابی نظریہ سامنے لایا جائے اور اس کی نشر و اشاعت کی جائے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو لوگ اس انقلابی نظریئے کو شعوری طور پر قبول کر لیں۔ انہیں منظم کر کے ایک اجتماعی شکل دی جائے ـــــ اور تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس انقلابی جماعت میں شریک لوگوں کی تربیت کی جائے۔ اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ تربیت پیش نظر انقلاب کی مناسبت ہی سے ہوگی۔ اگر خالص مادی انقلاب برپا کرنا ہے تو ساری تربیت مادی نوع کی ہوگی لیکن اگر پیش نظر انقلاب میں روحانی اور اخلاقی پہلو (Dimension) بھی شامل ہیں بلکہ انہیں اولیت حاصل ہے تو لامحالہ انقلابی جماعت کی تربیت میں اخلاقی و روحانی تربیت کا جزء مادی تربیت پر مقدم رہے گا ـــــ ان تین تمہیدی اقدامات کے ذریعے ایک 'انقلابی قوت' درحقیقت ایک 'انقلابی جماعت' کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اس کے بعد تصادم کے مراحل ہیں یعنی اب وہ انقلابی جماعت ٹکراتی ہے اس موجود الوقت نظام کے ساتھ جو باطل اور فاسد ہے جس کی بنیاد غیر اللہ کی حاکمیت کے تصور پر قائم ہے۔ گویا "بانشہ درویشی درساز و دمادم زن!" کے مراحل سے گزرنے کے بعد ایک انقلابی جماعت "چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!" کے مرحلے میں داخل ہوتی ہے۔

اس تصادم کے بھی تین مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ اسی وقت شروع ہو جاتا ہے جب داعیٔ اوّل اس انقلابی دعوت کا آغاز کرتا ہے۔ اس لئے کہ جیسے ہی کوئی شخص کسی معاشرے میں انقلابی دعوت پیش کرتا ہے تو یہ بات پس پردہ موجود ہوتی ہے کہ اس کے خیال کے مطابق رائج الوقت نظام فاسد ہے۔ وہ اسے صحیح نہیں سمجھتا۔ گویا انقلابی دعوت کا آغاز ہی اس نظام کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ یہ ہے وہ مرحلہ جس کا ردِعمل پھر اس معاشرے اور اس نظام کی طرف سے ظاہر ہونا لازم ہے۔ بالخصوص اس معاشرے کے وہ طبقات جن کے مفادات پر زد پڑتی ہے۔ وہ اسے کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ اس نظام کو غلط اور فاسد کہا جائے کہ جس کے ساتھ ان کے مفادات وابستہ ہیں۔ لہٰذا وہ اس نظام کے تحفظ کی پوری کوشش کریں گے اور تصادم کا پہلا مرحلہ یوں آئے گا کہ ان کی طرف سے اس انقلابی جماعت کے وابستگان پر تشدّد کیا جائے گا۔ لیکن اس مرحلہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انقلابی جماعت اس تشدّد (Persecution) کو برداشت کرے گی۔ اور کوئی جوابی کارروائی نہیں کرے گی حتیٰ کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھائے گی۔ یہ صبرِ محض کا مرحلہ ہے۔ جسے میں Passive Resistance سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر وہ انقلابی جماعت شروع ہی سے مشتعل (Violent) ہو جائے۔ مدافعانہ جدوجہد (Retaliation) شروع کر دے تو گویا رائج الوقت باطل نظام کو اس بات کا اخلاقی جواز حاصل ہو جائے گا کہ وہ انقلابی جماعت کو ابتداء ہی میں کچل دے۔ چنانچہ اس مرحلے پر صحیح طرزِ عمل یہی

ہے کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ اس طرزِ عمل کے دو نتائج نکلتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس صبرِ محض کے مرحلے میں جماعت کے کارکنوں کی تربیت ہوتی چلی جاتی ہے، ان میں قوتِ برداشت اور قوتِ ارادی پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان کا اپنے نظریہ کی حقانیت پر یقین و اعتماد بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس معاشرے کی خاموش اکثریت (Silent Majority) ہے۔ اس کی ہمدردیاں رفتہ رفتہ اس انقلابی گروہ کے ساتھ ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ اس جماعت کے لوگ جو ماریں کھا رہے ہیں اور مصائب برداشت کر رہے ہیں انہوں نے کوئی اخلاقی جرم نہیں کیا، ان کا جرم صرف اتنا ہے کہ جس بات کو حق سمجھ رہے ہیں، اسے علی الاعلان بیان کر رہے ہیں ـــــ کسی بھی انقلابی جدوجہد کے لئے یہ اہم ترین مرحلہ ہے۔ اس کے لئے میں ایک لفظ استعمال کیا کرتا ہوں 'To Buy Time' یعنی یہ عدمِ تشدد یا Passive Resistance کا مرحلہ درحقیقت وقت حاصل کرنے کا مرحلہ ہوتا ہے کہ جس میں دعوتی اساس (Base) مضبوط بھی ہو جائے اور وسیع بھی ہو جائے۔ بالفاظِ دیگر افراد بھی معتدبہ تعداد میں شامل ہو جائیں، پھر ان کی تربیت بھی ہو جائے، ان کو نظم کی پابندی کا خوگر بنا دیا جائے۔ ڈسپلن اور سمع و طاعت کا جذبہ ان کے رگ و پے میں اس طور سے سرایت کر جائے کہ وہ حکم سنیں اور بے چون و چرا اس پر عمل کریں۔ یہ ساری تیاری جو پہلے مرحلہ سے متعلق ہے ـــ اس کے لئے وقت درکار ہے ـــ وہ وقت اسی صورت میں ملتا ہے کہ وہ انقلابی جماعت ابتداءً کوئی جوابی کارروائی نہ کرے۔ بلکہ پوری دلجمعی سے متذکرہ بالا تیاری میں مصروف رہے ـــــ یہ ہے Passive Resistance یعنی صبرِ محض کا مرحلہ۔ اس کے بعد جب وہ انقلابی جماعت یہ محسوس کرے کہ اب ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم اس باطل و فاسد، ظالم و استحصالی اور غلط نظام کے خلاف راست اقدام کر سکتے ہیں تو صبرِ محض (Passive Resistance) کا مرحلہ اس موقع پر راست اقدام (Active Resistance) میں تحویل ہو جائے گا۔

زیرِ بحث دو مراحل کی قرآنی اصطلاحات اس انقلابی عمل کے لئے اکثر و بیشتر میں انہی اصطلاحات کو استعمال کرتا ہوں جو دورِ جدید میں مستعمل ہیں اس لیے کہ اگر میں خالص قرآنی اصطلاحات کے حوالہ سے بات کروں گا تو آپ کے اذہان میں وہ خالص ایک مذہبی سی بات بن کر رہ جائے گی۔ اور اس دور میں ان اصطلاحات کے جو انطباقات (Implications) ہیں ان کی جانب آپ حضرات کا ذہن منتقل نہیں ہوگا۔ اسی لئے میں

Passive Resistance اور Active Resistance کے الفاظ استعمال کرتا ہوں ورنہ ان کے لئے قرآن مجید کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ اس ضمن میں آج میں نے آغاز خطبہ میں آپ کو سورہ آل عمران کی آخری آیت سنائی تھی جس کے شروع میں امر کے صیغہ میں فرمایا گیا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا "اے ایمان والو! صبر سے کام لو، باطل کے علمبرداروں کے مقابلہ میں پامردی اور استقامت و ثبات کا مظاہرہ کرو، حق کے بول بالا کے لئے کمربستہ ہو جاؤ"۔ یہاں ایک لفظ آیا 'صبر' اور دوسرا آیا 'مصابرہ' ـــــ یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ "مصابرت" کا لفظ قرآن مجید مدنی دور میں استعمال کر رہا ہے جبکہ مکی دور میں ہمیں قرآن میں صرف صبر کا لفظ ملتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے بار بار متعدد سورتوں میں مختلف اسالیب میں صبر کی تاکید کی گئی۔ مثلاً: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (الاحقاف)۔ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (هود) وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (الطور) وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (المزمل)۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صبر کی اسی تاکید کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جانب منتقل فرما رہے ہیں۔ آل یاسر سے فرماتے ہیں: اِصْبِرُوْا يَا اٰلَ يَاسِرٍ فَاِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ "اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو، برداشت کرو، جھیلو، اس لئے کہ تمہارے وعدہ کی جگہ جنت ہے"۔

پس آپ دیکھتے ہیں کہ مکی دور میں جو سورتیں اور آیات نازل ہوئیں ان میں بار بار ہمیں صبر کی تاکید ملتی ہے ـــ جھیلو! برداشت کرو۔ اس لئے کہ یہ صبر یک طرفہ ہو رہا ہے۔ ابھی اہل ایمان پر ستم ڈھائے جا رہے ہیں اور وہ جھیل رہے ہیں۔ ابھی انہیں تشدد و مظالم کا ہدف بنایا جا رہا ہے اور وہ برداشت کر رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہے، کسی کو مکہ کی تپتی سنگلاخ زمین پر رسیاں باندھ کر گھسیٹا جا رہا ہے، کسی کو چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھونی دی جا رہی ہے۔ الغرض جس کا جس پر زور چلتا ہے وہ تشدد میں کمی نہیں ہونے دیتا لیکن کوئی بھی اپنے دفاع میں ہاتھ تک نہیں اٹھا رہا۔ اس لئے کہ اجازت نہیں تھی۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مکی دور کے قریباً بارہ سال تک یہی حکم رہا ہے کہ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ لہٰذا مکی دور میں آپ کو قرآن مجید میں صرف 'صبر' کا لفظ ملے گا یہ ایک طرفہ عمل ہے۔ اب مدنی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لفظ کچھ بدلی ہوئی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اب حکم ہو رہا ہے 'مصابرہ'

کا۔ اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ مصابرہ یا مصابرت کا حکم آتا ہے۔ یہ لفظ بابِ مفاعلہ سے بنا ہے۔ اور اس باب کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں آمنے سامنے دو فریق ہونے لازمی ہیں۔ گویا 'مصابرہ' کے معنی ہوں گے صبر کا صبر سے ٹکراؤ۔ جیسے قتل ایک طرفہ عمل ہے کوئی شخص اپنے کسی کام سے گھر سے نکلا کہ کسی نے گولی ماردی۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اس طرح قتل کردیا جائے گا۔ لیکن مقاتلہ کے معنی ہیں جنگ۔ جس میں دو فریق ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ یہی فرق ہوگا 'جہد' اور 'مجاہدہ' کا۔ 'جہد' یک طرفہ کوشش ہے۔ جبکہ 'مجاہدہ' یا 'جہاد' کے معنی ہوں گے کوشش کا کوشش سے مقابلہ۔ بالکل یہی نسبت 'صبر' اور 'مصابرہ' میں ہے۔ اب صبر کا مقابلہ صبر سے ہوگا۔ وہ تم پر زیادتیاں کر رہے ہیں تو اب تم بھی ان کے خلاف اقدام کرو۔ معلوم ہوا کہ اب دو طرفہ صبر کا مظاہرہ ہوگا۔ مشرکین کو بھی جھیلنا پڑے گا، انہیں بھی جان کی بازیاں کھیلنی ہونگی۔ اگر وہ اپنے باطل نظریہ اور فاسد نظام کا تحفظ چاہتے ہیں۔ تو انہیں بھی قربانیاں دینی پڑیں گی۔ 'مصابرہ' اسی عمل کا نام ہے کہ صبر کا صبر سے ٹکراؤ اور مقابلہ ہو جس فریق میں قوتِ صبر زیادہ یعنی برداشت کی طاقت زیادہ ہوگی بازی اس کے حق میں جائے گی۔ اب اسی مرحلے پر معلوم ہوگا کہ اہلِ حق اور اہلِ باطل میں سے کون سا فریق زیادہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ کون اپنے مشن (Cause) کے لئے کتنی قربانیاں دے سکتا ہے! ۔ تو صبر جب مصابرت میں بدلتا ہے تو یہ ہے درحقیقت Passive Resistance کا Active Resistance میں تبدیل ہوجانا ـــــ تو ہماری آج کی گفتگو کا خاص موضوع یہی ہے۔

چونکہ میں نے ابھی جہاد اور قتال کی وضاحت کی ہے۔ لہٰذا اسی موقع پر اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ گویا اب جہاد بھی قتال میں بدلے گا۔ اس لئے کہ اب تک کشمکش اور کشاکش تو ہو رہی تھی لیکن اہلِ ایمان کو ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن جب اجازت مل گئی اور اہلِ ایمان کی طرف سے بھی اقدام ہوا تو اب مسلح تصادم تک نوبت جا پہنچی۔ لہٰذا درحقیقت یہ وہ مرحلہ ہے جہاں جہاد قتال میں بدل جاتا ہے۔ 'صبر' کا 'مصابرت' میں تبدیل ہونا اور 'جہاد' کا 'قتال فی سبیل اللہ' میں تبدیل ہونا، یہ مرحلہ ہے جس کے بارے میں ہمیں آج گفتگو کرنی ہے۔

موضوع کی اہمیت میں اس سلسلہ میں یہ عرض کردوں کہ اس وقت ہم مجرد گفتگو نہیں کر رہے بلکہ یہ تمام تر گفتگو سیرت النبی ـــــ کے پس منظر میں ہو رہی ہے بالفاظِ دیگر انقلابی مراحل کے حوالے سے ہم درحقیقت سیرت النبی کا مطالعہ کر رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی انقلابی جد وجہد کے جس مرحلے پر ہم آج کی نشست میں گفتگو کر رہے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ انتہائی اہم ہے، یہ درحقیقت حضورؐ کی سیرت کا ایک نہایت نازک موڑ اور لمحہ (Critical Moment) ہے کہ منہج تبدیل ہو رہا ہے، صبرِ محض کی پالیسی ترک کرکے اقدام کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین نے اس کو تضاد قرار دے کر اس کا محاکمہ کیا ہے اور اس ظاہری تضاد (Contrast) کو کافی نمایاں کیا ہے۔ مسٹر منٹگمری واٹ نے سیرت مبارکہ پر دو علاحدہ علاحدہ کتابیں لکھی ہیں۔ ایک کا نام ہے ——— 'Muhammad at Macca' اور دوسری کا نام ہے 'Muhammad at Medina'، گویا یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مکّہ والے محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) دراصل مدینہ والے محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) سے مختلف ہیں۔ اس کے خیال میں مکّہ والے محمد ایک داعی ہیں، مبلّغ ہیں، مزکّی ہیں، مربّی ہیں۔ غرضیکہ ان حضرات کو حضرت عیسٰی (علیہ السلام) کے اندر نبوّت کے جو اوصاف نظر آتے ہیں وہ مکّی دور کی حد تک حضورؐ میں بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن مدینہ میں نقشہ کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ آپؐ فوج کے سپہ سالار ہیں اور جرنیل ہیں، آپؐ مدینہ کی ریاست کے سربراہ ہیں۔ آپؐ ہی چیف جسٹس کا رول ادا کر رہے ہیں معاہدے کر رہے ہیں۔ گویا مدینہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ایک مدبّر سیاست دان کے روپ میں نظر آ رہے ہیں ——— میں نے ٹائن بی (TOYN BEE) کا یہ جملہ آپ کو بارہا سنایا ہے۔ درحقیقت یہ ہے بنیاد جہاں سے مسٹر منٹگمری واٹ کو بھی یہ پورا فکر ملا ہے۔ وہ کہتا ہے،

Muhammad (صلی اللہ علیہ وسلم) failed as a Prophet but succeeded as a Statesman.[1]

گویا کہ انہیں مکّہ والے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم میں تو نبوّت کی شان نظر آ رہی ہے۔ اس لئے کہ ان کے اذہان میں نبیوں کی جو تصویر ہے حضرت یحیٰی کی حضرت عیسٰی کی علیہما السلام۔ وہی تصویر ان کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مکّہ میں نظر آ رہی ہے لیکن مدینہ میں سیرتِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام) کا جو نقشہ ان کو نظر آتا ہے وہ ان کے خیال کے مطابق نبوّت والا معاملہ نہیں ہے۔ وہاں تو ان لوگوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم بحیثیت ایک سیاست دان و مدبّر، ایک سربراہِ مملکت اور ایک جرنیل کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ بات واقعی سمجھنی چاہیئے کہ یہ منہج عمل کیسے تبدیل ہوا ہے۔! وہ تحویلی مرحلہ (Transitory Phase) کب آیا اور کیسے آیا! اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظامِ باطل کے خلاف راست اقدام کیسے کیا تھا!!

---

[1] ترجمہ: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) بحیثیتِ نبی ناکام ہو گئے اور بحیثیت سیاست دان کامیاب رہے۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک)

سیرتِ مطہرہ کے اس پہلو کے مطالعہ سے پہلے یہ بات جان لیجئے کہ کسی انقلاب کے لئے راست اقدام (Active Resistance) کا فیصلہ بہت نازک (Crucial & Critical) ہوتا ہے۔ آپ نظری طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ راست اقدام کا فیصلہ قبل از وقت ہو جائے گا تو دنیوی اعتبار سے انقلاب ناکام ہو جائے گا۔ اگر آپ کی تعداد معتدبہ نہیں ہے، اگر آپ کی تربیت خام رہ گئی ہے تو دنیاوی ناکامی کا سامنا ہوگا۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ کشتہ میں اگر ایک آنچ کی کسر رہ گئی اور بعض اوقات یہی ذراسی آنچ کی کسر تباہ کن ہو جاتی ہے اور وہ کشتہ مقوی جسم و جاں بننے کی بجائے ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی طرح اگر تربیت میں خامی اور کمی رہ گئی۔ ابھی کہ "چوں پختہ شوی خود را بسلطنت جم زن!" والا معاملہ نہیں ہوا۔ قبل از وقت اقدام کر دیا گیا تو ناکامی ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ بڑا نازک لمحہ ہوتا ہے۔ اس کے صحیح یا غلط ہونے پر انقلاب کے کامیاب یا ناکام ہونے کا دارومدار ہوتا ہے۔ اگر Premature (قبل از وقت) اقدام کر دیا گیا تو دنیا میں اس جدوجہد کا ناکام ہونا لازم ہے۔ خواہ خلوص و اخلاص کا کتنا ہی ذخیرہ اس جدوجہد کی پشت پر موجود ہو

انبیاء و رسل کا خصوصی معاملہ

البتہ یہ بات جان لیجئے کہ جہاں تک جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء و رسل کا معاملہ ہے یہ فیصلے درحقیقت اللہ کی طرف سے وحی جلی یا وحی خفی کے ذریعے سے ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ اجتہادی طور پر اگر رسول کوئی قدم اٹھاتے تھے تو اللہ کی طرف سے اس کی تصویب یا اصلاح ہو جاتی تھی لیکن اگر وحی کے ذریعہ نہ تصویب ہوئی ہو نہ اصلاح تو گویا رسول کے اس اجتہادی فیصلہ کی اللہ کی طرف سے خاموش توثیق حاصل ہو گئی۔ لہٰذا اس معاملہ میں رسولؐ تو محفوظ و مامون اور معصوم ہیں ـــــ اس ضمن میں عرض کر دوں کہ حضورؐ کی سیرتِ مطہرہ میں ہمیں ایک واقعہ ملتا ہے کہ حضورؐ کا ایک اجتہادی فیصلہ تھا اور وہ فیصلہ حضورؐ نے سن دس نبوی میں اس وقت کیا جب مکہ میں مشرکین نے دارالندوہ میں حضورؐ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا تو حضورؐ نے طائف کا سفر اختیار فرمایا۔ اس فیصلہ کی تصویب یا اصلاح وحی کے ذریعے نہیں ہوئی۔ گویا اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ طائف والے بھی ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صبر و ثبات اور عزیمت کی خوب اچھی طرح جانچ پرکھ کر لیں۔ چنانچہ طائف میں ایک دن میں رحمۃ للعالمین کے ساتھ وہ سلوک ہوا جو مکی زندگی کے دس برس میں نہیں ہوا۔ جس کو بیان کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے اور جس کو پڑھتے ہوئے دل کانپ جاتا ہے ـــــ وہاں دعوتی اعتبار سے حضورؐ کے لئے کامیابی کی کوئی شکل نہ بن سکی [1] اللہ تعالیٰ کی مشیت میں یہ بات طے شدہ تھی کہ "مدینۃ النبی"

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

بننے کی سعادت یثرب کے حصّے میں آنے والی ہے ۔ طائف کے نصیب میں یہ سعادت نہیں تھی۔ حالانکہ آپ غور کیجئے کہ طائف دعوت و تبلیغ کے لیے حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں سے ناکام لوٹنا پڑا اور دوسری جانب صورت یہ ہے کہ آپؐ مکہ میں مقیم ہیں لیکن اللّٰہ تعالیٰ نے یثرب کے لئے کھڑکی کھول دی۔ اسی سال یعنی سن ۱۰ھ میں حج کے موقع پر یثرب کے چھ حضرات ایمان لے آئے ۔ ان چھ حضرات کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا ۔ اور یہ قبیلہ افرادی و مادی قوت کے لحاظ سے یثرب کا بڑا مضبوط قبیلہ تھا ۔ اگلے سال ان چھ میں سے پانچ آگئے اور سات مزید افراد کو ساتھ لے آئے ، جن کو انہوں نے اپنی تبلیغ و دعوت سے مسلمان کر لیا تھا ۔ چنانچہ اس دفعہ بارہ حضراتؓ نے حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کر لی ۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور ہمیں اپنا کوئی ایسا جاں نثار شاگرد

(حاشیہ صفحہ ۷۱)

چودھویں صدی کے جید و باعمل عالم دین، عارف باللہ، علوم جدیدہ و قدیمہ پر گہری بصیرت کے حامل اعلیٰ پایہ کے محقق و مفکر، صاحبِ طرز ادیب، متعدد اعلیٰ علمی و تحقیقی کتب کے مصنف مولانا سید مناظر احسن گیلانی نور اللہ مرقدہٗ کی سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر "النبی الخاتم" کے نام سے ایک مختصر لیکن نہایت جامع کتاب جو اپنی جگہ ادب کا بھی ایک شہ پارہ ہے ۔ اس کتاب میں مولانا مرحوم و مغفور نے مکّہ کے دس سالہ جاں گسل مصائب اور طائف کے ایک دن کے شدائد پر جس انداز میں تبصرہ فرمایا ہے وہ روح کے لئے مضراب کا کام دیتا ہے ۔ مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں :

"منفی قانون ختم ہو چکا تھا، طائف کی گھاٹیوں میں ختم ہو چکا تھا اور قطعاً ختم ہو چکا تھا کہ اس کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو چکا تھا ، اندر باہر آگیا ، پوری طاقت سے آیا ، ہر شکل میں ، ہر صورت میں آیا ۔ دے کر بھی دیکھا گیا اور پورے طور پر دیکھا گیا لے کر بھی جانچا گیا اور جی بھر کر جانچا گیا ، سال دو سال نہیں ، ایک جُگ ، ایک قرن سے زیادہ موقع دیا گیا تاکہ ٹھونکنے والے ٹھونک لیں ، بجانے والے بجا لیں ، کسنے والے کس لیں ، تانے والے تا لیں ، آزمائش کی کون سی بھٹی تھی ، جس میں قدرت کے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا یہ زرِ خالص نہیں ڈالا گیا ۔ حرارت کا کون سا درجہ ہے جو اس کی غیر معمولی لاہوتی حقیقت کو نہیں پہنچایا گیا ۔ جو کچھ کر سکتے تھے ، سب کچھ کر لیا گیا ۔ اس کے آگے کیا کچھ اور بھی سوچا جا سکتا ہے ۔ جیسے تم نے مکّی زندگی کے ان سالوں میں مسلسل تابڑ توڑ پیہم "صدق" و "دیانت" کے اس بے نظیر سرچشمہ کے ساتھ ہوتے ہوئے دیکھا ، شہادتیں تمام ہو گئیں ، گواہیاں پوری ہو چکیں ، تجربات مکمل طور پر ہو چکے ، مشاہدات اکٹھے ہو چکے ، الغرض عالمِ امکان میں جو کچھ ہو سکتا تھا ، سب کچھ ہو گیا ، منفی قوانین اپنے سارے حقوق لے کر اپنے حدود کے آخری ، بالکل آخری نقطہ پر پہنچ کر ختم ہو چکے تھے ـــــ یقیناً وہی وقت آگیا تھا ، اور اب نہ آتا تو کب آتا کہ واقعات کے دوسرے رُخ کا آغاز ہو۔"

دیجئے کہ جو ہمیں قرآن پڑھائے اور یثرب والوں کو قرآن کے ذریعہ سے دعوتِ توحید دے ۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ تبلیغ و دعوتِ محمدیؐ کا مرکز و محور اور منبع و مدار قرآن مجید ہے ۔ گویا یثرب میں اس انقلابی دعوت کی نشر و اشاعت کے لئے یثرب والوں کی جانب سے یہ تقاضا سامنے آیا کہ کوئی ایسا شخص انہیں دیا جائے جو انہیں قرآن پڑھا سکے ۔ "قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند" کے مصداق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ اور عبداللہ ابن مکتومؓ کو اس اہم کام کے لئے منتخب کیا ۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات یثرب تشریف لے گئے ۔ ان دونوں کی دعوت و تبلیغ کا ثمرہ اگلے سال حج کے موقعہ پر ظاہر ہو گیا ــــ سیرت کی مختلف کتابوں میں مختلف تعداد ملتی ہے ۔ کسی میں ستر مرد اور دو عورتیں اور کسی میں بہتر مرد اور تین خواتین. یہ تعداد زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔ بہرکیف پچھتر افراد لاکر انہوں نے گویا حضورؐ کی جھولی میں ڈال دیئے ۔ بیعتِ عقبہ ثانیہ ہو گئی ۔ مردوں نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا کہ اگر مکّہ والے آپؐ کے خون کے پیاسے ہیں تو آپؐ ہمارے یہاں تشریف لائیے ۔ اگر مکّہ والوں نے مدینہ (یثرب) پر حملہ کرنے کی جسارت و جراُت کی تو ہم آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں ــــــ یہ ہے بیعتِ عقبہ ثانیہ جسے سیرتِ مطہرہ میں ایک اہم نشانِ راہ (Land Mark) کی حیثیت حاصل ہے ۔ اور یہ ہے سیرت کا وہ اہم موڑ جس کی وجہ سے یثرب کو 'مدینۃ النبیؐ' اور 'دار الہجرت' بننے کی سعادت نصیب ہوئی ۔

میں نے یہ تمام تفصیل اس وقت صرف یہ واضح کرنے کے لئے آپ کے سامنے رکھی ہے کہ یہ فیصلہ کون کر رہا ہے ! یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ یثرب کو دار الہجرت بننا ہے طائف نہیں ۔ وہ تبارک و تعالےٰ قدم قدم پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی متلو (یعنی قرآن مجید) اور وحی غیر متلو (یعنی کشف، القاء، الہام اور رؤیائے صادقہ) کے ذریعے حضورؐ کی رہنمائی فرما رہا ہے ۔ حضورؐ کے کسی اجتہادی عمل پر خاموشی ہے تو یہ گویا اللہ کی طرف سے اس کی توثیق و تائید ہے ــــ لیکن مابعد کا معاملہ بالکل مختلف ہے ۔ نبوت و رسالت کا اتمام و اکمال حضورؐ کی ذات پر ہو گیا ۔ اب تا قیام قیامت کسی نوع کا نبی نہیں آئے گا ۔ لہٰذا اس کے بعد جو بھی اسلامی احیائی تحریکیں اٹھی ہیں یا اٹھیں گی وہ ظاہر بات ہے کہ ان کی قیادت انبیاء و رسل کے ہاتھوں میں نہ رہی ہے نہ رہے گی ۔ یہ قیادت کی ذمہ داری تو کسی اُمتیِ محمدؐ ہی نے ادا کی ہے اور آئندہ بھی یہ کام کسی اُمتی ہی کے ذریعے ہوگا ۔ اور کوئی اُمتی بھی معصوم عن الخطا نہیں ہے ۔ معصومیت خاصۂ نبوت ہے ۔ نبوت ختم ہوئی تو معصومیت بھی ختم ہوئی ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاں خاتم النبیین ہیں وہاں خاتم المعصومین بھی ہیں ــــ شیعہ مکتبِ فکر کا معاملہ بالکل علاحدہ ہے کہ وہ بزعمِ خویش جن اماموں کو مامور من اللہ مانتے ہیں تو ان کو معصوم عن الخطا بھی تسلیم کرتے ہیں ۔ اس امکان کو اپنے ذہن سے بالکل محو کر دیجئے اور جان لیجئے کہ اب تجدیدِ دین، احیاءِ اسلام کی جو تحریک بھی برپا ہو گی، اس کے ہر مرحلہ کا معاملہ

اجتہادی ہوگا ـــــ اور اس اجتہاد میں خطا کا امکان رہے گا۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا، کسے باشد، کہ خطا کا امکان نہیں ہے۔ جس نے یہ دعویٰ کیا وہ اہل سنّت والجماعت کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا۔

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ میں 'تحریک شہیدین' کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ میں نے اپنا یہ تاثر بارہا عرض کیا ہے کہ دورِ صحابہ کے بعد ایک خالص اسلامی تحریک ہونے کے اعتبار سے، تحریک شہیدین کے ہم پلہ کوئی دوسری تحریک مجھے نظر نہیں آتی۔ اس تحریک کے قائد تھے سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہیدؒ بھی شامل تھے۔ تقویٰ، تدیّن، خلوص و اخلاص کا اتنا بڑا سرمایہ دورِ صحابہؓ کے بعد اسلامی تاریخ میں مجھے کہیں اور نظر نہیں آتا۔ انفرادی سطح پر بڑی بڑی عظیم شخصیتیں ہر دور میں نظر آتی ہیں۔ مجدّدِ دین امّت ہیں، ائمہ امت ہیں، محدثین کرام ہیں، فقہاءِ نظام ہیں۔ انفرادی سطح پر علم، تقویٰ، تدیّن اور خلوص و اخلاص کے اعتبار سے ہر شخص کو وہ ہمالیہ نظر آتا ہے لیکن اجتماعی سطح پر، ایک گروہ کی شکل میں، ایک جماعت کی صورت میں اتنے متقی و متدیّن حضرات اور اتنا خالص اسلامی جہاد بالسیف کم از کم مجھے دورِ صحابہؓ کے بعد کہیں اور نظر نہیں آتا۔ واللہ اعلم ـــــ لیکن وہاں بھی ایک اجتہادی خطا ہو گئی۔ قبل از وقت اقدام ہو گیا۔ حضرت سیّد احمد بریلویؒ نے اپنے ان ساتھیوں کی بھرپور تربیت کی تھی جن کو ساتھ لے کر وہ سرحد کے علاقہ میں پہونچے تھے ـــــ لیکن انؒ کی اصل جدوجہد شروع ہوئی تھی ضلع پشاور اور ضلع مردان سے ـــــ وہاں جا کر اقدام سے پہلے وہاں کے مقامی باشندوں کی تربیت کی بھی ضرورت تھی۔ یا تو وہاں کے تمام خوانین اور رعایا سیّد صاحب رحمہ اللہ کو قطعی طور پر اپنا امیر تسلیم کر لیتے اور انؒ کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت اور جہاد کر لیتے۔ تب بھی کوئی مضبوط اساس قائم ہو جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ البتہ ایک یا دو قبیلوں کے خوانین نے بیعت کر لی تھی جو میری رائے میں کافی نہیں تھی۔ ہوا یہ کہ مقامی لوگوں کی تربیت سے پہلے اور وہاں اپنے آپ کو مستحکم (Consolidate) کرنے سے پہلے، ایک طرف سکھوں کے ساتھ جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ دوسری طرف اسلامی شریعت کے حدود و تعزیرات نافذ کر دی گئیں جو مقامی لوگوں کے لئے بڑی شاق تھیں۔ چونکہ وہ لوگ ایک مدت سے دین کے صحیح و حقیقی علم سے ناواقف تھے، اور اگرچہ وہ مسلمان تھے لیکن ان میں سے اکثر حقیقی ایمان کے لذّت آشنا نہیں تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اکثریت نے نہ صرف سیّد صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا بلکہ بعض بااثر خوانین نے سیّد صاحب کے خلاف سازشیں کیں، آپ کو زہر دیا گیا۔ مجاہدین کے کیمپوں پر شب خون مارا گیا

اور بے شمار مجاہدین کو شہید کر دیا گیا۔ آپؐ کے خلاف مخبری کی گئی اور سکھوں کو مجاہدین کے لشکر کی نقل و حرکت اور اس کی قوت و وسائل کی خبریں پہنچائی گئیں۔ الغرض مقامی لوگوں کی اکثریت کی ناپختہ سیرت و کردار اور عدم تربیت کے باعث یہ عظیم اسلامی تحریک دنیاوی اعتبار سے ناکام ہوگئی۔

میں نے تحریک شہیدین کا ذکر اس غرض سے کیا ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ تربیت کی کیا اہمیت ہے اور اقدام کے مرحلے کے لئے صحیح وقت کا تعین کیا اہمیت رکھتا ہے۔ سیّدؒ صاحب نے حسن ظن سے کام لیتے ہوئے مقامی لوگوں کو سچا اور پکا مسلمان سمجھ کر جو اقدام کیا اور سکھوں سے جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا تو میرے نزدیک یہ خطا تھی لیکن یہ بات جان لیجئے کہ یہ خطا اجتہادی ہے اور اہل سنّت کے نزدیک خطا اجتہادی پر بھی آخرت کا اجر محفوظ رہتا ہے۔ ایک انسان اپنی امکانی حد تک غور کرنے کے بعد اپنی رائے میں صحیح فیصلہ کر رہا ہے۔ اس نے سوچ بچار اور غور و تدبّر میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے اور اس کے بعد اس نے اقدام کیا ہے تو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا اُخروی اجر و ثواب بالکل محفوظ ہے۔ اس میں قطعاً کوئی کمی نہیں ہوگی۔ لیکن دنیوی اعتبار سے وہ جدوجہد، وہ تحریک ناکام ہو جائے گی۔ یہ بات نہ صرف ماضی کے لئے ہے بلکہ آئندہ کے لئے بھی ہے بہرحال کسی تحریک میں وہ وقت آتا ہے کہ جب اس کے قائد کو 'اقدام' کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہوگا کہ پوری طرح سوچ بچار کر کے حدِ استعداد کے مطابق حالات کا پورا جائزہ، اقدام کا فیصلہ اور اپنی جمعیت کی تعداد اور اس کی تربیت کو پوری طرح تول کر اقدام کا فیصلہ کرے اور اس میں بھی اس کا تمام تر توکّل اللہ ہی کی ذات پر ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ہی اصل حامی و ناصر ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست! تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

لیکن تحریک کا قائد اور اس کے ساتھی ذہناً اس کے لئے تیار ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی خطا رہو جائے اس لئے کہ اب کوئی نبی نہیں ہے کوئی معصوم نہیں ہے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں ــــــ!

ہر دانہ منتخب
فریش ویل
بادام اور پستہ
تلے ہوئے - تازہ
مصالحے دار - ذائقے دار
نمکینیت کے تیتے پہلو اور
بھرپور ذائقے کے ساتھ
Freshwell
Freshwell
ناشتے پر
چائے پر یا کسی بھی وقت
لذت میں ایک خوشگوار اضافہ
جدید ترین نائٹروجن پلانٹ پر
پیک کیے جاتے ہیں۔
سیل بند ڈبے کو کھولنے کا سہل ترین
طریقہ پاکستان میں پہلی بار
ہم نے متعارف کرایا۔

MASS

شادی بیاہ کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک اور اس سے متعلق بعض تنقیدات کا جائزہ

از قلم : مولانا سعید الرحمٰن علوی

"نکاح" جسے رسولِ رحمت علیہ السلام نے "سُنّتِی" قرار دیا، اس کا لغوی معنی وابستگی اور پیوستگی کا ہے جیسا کہ مصر کے معروف عالم علّامہ عبدالرحمٰن الجزیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی معروف کتاب "الفقہ علی مذاہب الاربعہ" میں تفصیل سے لکھا (ج ۴)

مولانا عبید اللہ سندھی علیہ الرحمہ نے اس عمل کو "تدبیرِ منزل" میں شمار کیا۔ "تدبیرِ منزل" نام ہے اس قانون کا جو انسان کے باہمی تعلقات و روابط کے استحکام کا باعث ہو۔ ان کے نزدیک گھر کی چار دیواری اس نظم و انتظام کی سب سے اچھی درسگاہ ہے۔ جہاں شادی بیاہ کے حوالہ سے انسانیت کی تربیت کا بیج بویا جاتا ہے، وہ پھر وہ تناور درخت بن کر پورے عالم و جہان پر چھا جاتا ہے۔ بقول ان کے گھر کی چار دیواری میں اس کا عنوان "تدبیرِ منزل" ہوتا ہے تو قوموں اور ملکوں پر پھیل کر یہی قانون "سیاستِ مدن" اور "خلافتِ کبریٰ" کا عنوان اختیار کر لیتا ہے (ملاحظہ فرمائیں الفرقان فی معارف القرآن ص ۳۵۵، ۳۵۶، مطبوعہ دارالارشاد جامعہ ملیہ علیگڑھ) اسی کتاب میں آگے چل کر بطور خاص سورۂ بقرہ کی ان آیات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے جن میں نکاح اور اس ضمن کے دوسرے مسائل کا ذکر ہے۔

حضور نبی کریم علیہ السلام سے ایک روایت ام المؤمنین سیدتنا عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ذکر فرمائی جسے امام بیہقی علیہ الرحمہ نے نقل کیا۔ اس روایت کا ترجمہ ہے:

"وہ نکاح بہت ہی بابرکت ہے جس کا بار کم سے کم پڑے"

اس روایت کو ہمارے دور کے نہایت درجہ ذمہ دار عالم مولانا محمد منظور نعمانی زید مجدہم نے نقل کر کے جو تبصرہ کیا اور جو تشریح فرمائی وہ لائقِ مطالعہ ہے:

"ظاہر ہے کہ اس حدیث کا مقصد صرف ایک حقیقت بیان کر دینا نہیں ہے بلکہ اس میں

امت کو ہدایت و رہنمائی دی گئی ہے کہ شادیاں ہلکی پھلکی اور کم خرچ ہوا کریں اور بشارت سنائی گئی ہے کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری شادیوں اور اس کے نتیجوں میں بڑی برکتیں ہوں گی ـــــ آج ہم جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں اور خاص کر خانگی زندگی میں جو الجھنیں ہیں ان کا بہت بڑا سبب یہی ہے کہ نکاح و شادی کے بارے میں حضور علیہ السلام کی ان ہدایات سے انحراف کر کے ہم آسمانی برکات اور خداوندی عنایات سے محروم ہو گئے ہیں۔" (معارف الحدیث صہ۲۹، ج : ۷)

مولانا نعمانی کے اس ارشاد کو سامنے رکھ کر ذرا اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں اور روایتی طور پر دین سے ناآشنا اور اس قسم کے لوگوں کی شادیوں کا نہیں اہلِ دین کی شادیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو دل پر پتھر رکھ کر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہم نے اس نیک عمل، سنّتِ رسولؐ و مرسلینِ سابقہ اور اس ایک طرح کے عملِ عبادت کو دعوتوں، جہیز، برات اور نمائشی مہر کے ذریعہ ایک مصیبت بنا دیا ہے۔ اس کے بد اثرات جو معاشرہ میں سامنے آ رہے ہیں وہ بالکل ظاہر ہیں۔ لاتعداد خاندان اپنی جواں سال بچیوں کو گھروں میں بٹھانے پر اس لئے مجبور ہیں کہ ظالم معاشرے کے سنگدلانہ ضوابط اور خود ساختہ اقدار و قوانین کا پورا کرنا ان کے بس میں نہیں، اس صورت حال کا مقابلہ اور اس کی اصلاح ہر اس انسان کا فرض ہے جسے اسلام سے وابستگی کا دعویٰ ہے اور خاص طور پر ان پر فرض ہے جنہیں اہلِ علم ہونے کا شرف حاصل ہے اور جو مختلف حوالوں سے خدمتِ دین کے دعویدار ہیں لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا اب تو اہلِ دین کی شادیاں دیکھ کر انگلیاں دانتوں میں دبانا پڑتی ہیں چہ جائیکہ کوئی ایسی لہر اٹھے جس سے اس صورتِ حال کی اصلاح ہو۔ ہاں اگر کوئی اصلاح کی بات کرتا ہے تو اس پر تنقید و اعتراض کی بوچھاڑ اس طرح ہوتی ہے کہ الاماں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس سلسلہ کی ایک تحریک بپا کی تاکہ شادی و نکاح کا عمل سادگی سے انجام پائے۔ امکانی حد تک اس پر سنّتِ نبوی کی چھاپ ہو۔ اسراف و تبذیر اور تکلفات سے بچا جائے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء کو اپنے برادرِ اصغر ڈاکٹر ابصار احمد صاحب کی شادی سے غالباً اس سلسلہ کی ابتدا کی اور اسی دور میں ایک ۴ ورقی پمفلٹ بھی شائع کیا جو گویا اس سلسلہ میں ان کے ایک طے شدہ پروگرام کا اعلان تھا۔ اس میں انہوں نے اپنے لئے تین باتوں کا اعلان کیا:

کسی برات میں شریک نہ ہوں گا۔ نکاح کے موقعہ پر کسی دعوتِ طعام میں شرکت نہ کروں گا۔ بیرونِ مسجد کسی تقریبِ نکاح میں شرکت نہ کروں گا۔ (صہ۳)

نیز انہوں نے جملہ احباب و رفقاء کو توجہ دلائی کہ وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔ اگر بات دل

لگے تو ہمت کر کے عمل کی راہیں نکالیں۔ ان کا یہ پمفلٹ بڑی تعداد میں تقسیم ہوا۔ ان کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ "میثاق" لاہور میں یہ تحریر چھپی۔ کراچی کے معروف ادارے صدیقی ٹرسٹ نے بڑی تعداد میں چھاپ کر تقسیم کیا اور بعد میں اس میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ ترمیم نہیں اضافہ کر کے اسے ایک معقول رسالہ بنا ڈالا جو شائع شدہ میسر ہے۔ اور جس میں بڑی کام کی باتیں ہیں۔

لیکن تعجب ہوا اس پر کہ ملک کی ایک معروف دینی درسگاہ کے ایک معمر اور قابل احترام عالم و مفتی نے اس پر تنقید کر ڈالی۔ اور اب پھر ایک عرصہ کے بعد وہی تنقید میری محبوب درسگاہ جامعہ خیر المدارس ملتان کے آرگن "الخیر" میں چھپی۔ جن بزرگ عالم نے یہ تنقید کی یعنی حضرت مولانا مفتی جمیل احمد زید مجدہم، ان کی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے عزیز داری بھی ہے اور غالباً انہوں نے حضرت کے زیر نگرانی افتاء کا کام بھی کیا۔ بہر حال انہیں حکیم الامت علیہ الرحمہ سے جسمانی و روحانی نسبت حاصل ہے۔ مرشد تھانوی نے مختلف دوائر میں جس طرح اصلاح کا کام کیا اس کا ایک زمانہ معترف ہے۔ اور ان کے اصلاحی کام پر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے استاذ فلسفہ مولانا عبد الباری علیہ الرحمہ نے ہم ضخیم کتابیں لکھیں۔ مرشد تھانوی نے معاشرت کے حوالہ سے بھی بڑی تفصیل سے لکھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بہت سی غلطیوں کی بڑی ہمت سے اصلاح فرمائی۔ شادی نکاح کے بارے میں انہی کا ارشاد ہے، جب کسی نے پوچھا کہ یہ عمل ہے تو سنّت لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو ساس ایک بہو کو بڑے ارمان سے لاتی ہے، چند دن بعد وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہوتی ہیں اور مرد بیچارہ بھیگی بلی بن کر تصویر حسرت نظر آتا ہے! تو آپ نے فرمایا کہ محض بے سوچے سمجھے خطبۂ نکاح پڑھ کر یہ سوچ لینا کہ برکت ہو گئی، عجیب بات ہے، اس موقعہ پر جو چند در چند خلاف سنّت کام ہوتے ہیں ان کی نحوست نہ ہو گی ــــ؟

حضرت الشیخ مفتی جمیل احمد زید مجدہم اسی مقدس خانقاہ سے وابستہ ہیں۔ ایک "کالجی مولوی" کی اس ضمن میں اصلاحی تحریک پر انہیں ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیئے تھا۔ غلطی کہیں نظر آتی تو محبت و شفقت کے انداز میں سمجھاتے۔ لیکن افسوس کہ انہوں نے اپنی بزرگانہ عظمت کا لحاظ کئے بغیر مفروضات کے سہارے جلی کٹی سنائیں اور پھر اس مضمون و مقالہ کو اسی خانقاہ تھانہ بھون کے ایک نہایت ہی بیدار مغز اور مصلح خادم خیر العلماء مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مدرسہ کے آرگن میں چھاپا گیا۔

ــــ فیا للعجب ویا حسرتا۔

گذشتہ "میثاق" میں راولپنڈی کے معروف ہفت روزہ "حرمت" کے حوالہ سے کسی صاحب

"حساس" کا ایک مضمون اس کے تعاقب میں چھپا ہے جس میں گو کہ کہیں کہیں لب ولہجہ کی تلخی ہے۔ لیکن اصولی طور پر یہ بات درست ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے محض اور محض مفروضات پر عمارت قائم کی ہے۔ خدا شاہد ہے کہ ہم نے اپنی محبوب درسگاہ کے اس آرگن میں شائع شدہ اس مضمون کو ۳، ۴ بار پڑھا۔ علمی تنقید ہوتی یا ڈاکٹر صاحب کی کسی واضح غلطی کی نشان دہی ہوتی تو ہم خود ان سے کہتے اور پورے زور سے کہ آپ اس غلطی کی اصلاح فرمائیں لیکن ہمیں اعتراف ہے کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اور ہم نے محسوس کیا کہ جذبات کی شدت ہے۔ "کالجی مولویوں" (جن سے حضرت مفتی صاحب نے تمہید باندھی) پر غصہ ہے اور اس غصہ میں سارا طبقہ گرایا گیا ہے۔ کالج کی تعلیم ایسی بری تو نہیں کہ اس پر ایسا غصہ کیا جائے۔ آخر کو قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم قدس سرہ نے اپنے بھانجے کو علیگڑھ میں ارباب علیگڑھ کی خواہش سے بطور مدرس بھیجا۔ دیوبند اور ندوہ کے بہت سے حضرات جب بھی اور اب بھی علیگڑھ کی مختلف کمیٹیوں میں رہے۔ دیوبند کے مایۂ ناز سپوت شیخ الہند مولانا محمود حسن نے علیگڑھ کے وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد کو دیوبند بلا کر دونوں اداروں کے طلبہ کے تبادلہ کی تجویز پیش کی جو منظور ہوئی۔ حضرت حکیم الامت کے خدام میں خواجہ عزیز الحسن مجذوب، مولانا عبد الماجد دریا آبادی، مولانا عبد الباری ندوی سے لے کر مخدوم گرامی ڈاکٹر عبد الحی صاحب عارفی تک بہت سے "کالجی مولوی" موجود ہیں۔ اب اگر کوئی "کالجی مولوی" ایسی بات کہتا ہے جس میں خیر غالب ہے تو اسے سراہنا چاہئے نہ کہ غضب ناک ہو کر ایسا رویہ اختیار کیا جائے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی اس تحریر میں شاید ایک لفظ ہے جس کو باعث اعتراض کہا جا سکے۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے خطبہ نکاح کے متعلق لکھا:

"میرا معمول ان مواقع پر یہ رہا کہ خطبہ نکاح کی صورت یہ نہ ہوتی کہ جیسے محض دعا ہی کو سنانا مطلوب ہے یا صرف بطور "جنتر منتر" پڑھ دینا مقصود ہے..... الخ (ص۲)"

لفظ "جنتر منتر" ظاہر ہے کہ کسی اہانت کے نقطۂ نظر سے نہیں لکھا گیا بلکہ خطبہ نکاح کو جس میں ایک مکمل رہنمائی ہے، جس بے توجہی سے پڑھا جاتا ہے اس میں صرف اس کا اظہار مقصود ہے اور اردو محاورہ ایسے مواقع پر اس طرح بولا جاتا ہے۔ لیکن مفتی صاحب نے اس لفظ کو بہت لیا اور پھر غصہ میں بہت کچھ فرما گئے۔ حالانکہ اگر یہ لفظ ثقیل محسوس ہوتا تو مشورہ دیا جا سکتا تھا کہ اسے بدل دیا جائے ایک لفظ کی آڑ میں ایک اصلاحی پروگرام کو تو نہ رگیدا جائے ——

خطبہ کے معاملہ میں "صاحب زجاجۃ المصابیح" نے جامع الترمذی سے نقل کیا کہ:

نشر الایات الثلاث سفیان الثوری ...... الخ (زجاجۃ صفحہ ۲ جلد ۲ مطبوعہ دکن)
کہ جو تین آیات خطبہ میں پڑھی جاتی ہیں امام سفیان ثوری قدس سرہٗ ان کی تفسیر بیان فرماتے۔
اور مولانا محمد منظور نعمانی خطبہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

افسوس یہ خطبہ پڑھنا بھی اب ایک رسم بن کر رہ گیا ہے، ورنہ اسمیں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی نصیحت اور یاد دہانی کی نکاح کے فریقین کو اور سب ہی کو ضرورت ہوتی ہے

(معارف الحدیث صفحہ ۲۱ ۔ ج ۷)

جو بات مولانا نعمانی نے کی اور جس طرح انہوں نے رونا رویا، اس کا اظہار یہاں بھی بجز اس سے زیادہ کچھ نہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ بقول مولانا نعمانی اب ایک رسم ہے کہ حمد وصلوٰۃ کے بعد قرآن کی یہ تین آیات پڑھیں اور قصّہ تمام۔ باقی پورے عرصہ میں بلکہ نکاح سے کئی دن پہلے سے اسراف وتبذیر، لہو ولعب اور فرائض سے غفلت کا جو چکر چلتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ مظلوم اور ستم رسیدہ امام مسجد تصویر بے کسی مجلس میں موجود ہوتا ہے۔ وہ جب ان آیات کو پڑھتا ہے اس وقت بھی غافل منش انسان کھیل کود اور گپ شپ میں مشغول ہوتے ہیں، موسیقی کی دھنیں، سگریٹ کا دھواں سب جاری ہوتا ہے۔ اگر اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے گھر میں نکاح کر کے ان آیات کے مطالب سے حاضرین کو آگاہ کیا جائے تو باہمی حقوق کے ساتھ ساتھ اور بہت سی حقیقتوں سے انہیں آگاہی ہوگی اور کیا عجب کہ کسی کی زندگی میں اصلاح کی صورت پیدا ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب جب مسجد میں نکاح کا کہتے ہیں تو اس کی بنیاد احادیثِ نبوی ہیں۔ ترمذی میں حضرت ام المؤمنین سیدتنا عائشہ طاہرہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی واضح روایت ہے۔ جس کا ترجمہ ہے :

" نکاح بالاعلان کیا کرو ۔ اور مسجدوں میں کیا کرو "

بقول مولانا نعمانی " مسجد کی برکت بھی حاصل ہوگی اور لوگوں کو جمع کرنے اور جوڑنے کی زحمت بھی نہ ہوگی۔ گواہوں اور شاہدوں کی شرط بھی آپ سے آپ پوری ہو جائے گی۔" (صفحہ ۱۹، ج ۷)

" صاحبِ زجاجۃ " نے " مرقاۃ " شرح مشکوٰۃ کے حوالہ سے لکھا۔

" مسجد میں نکاح کا انعقاد حضرت امام ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مستحب ہے۔ کیونکہ یہ عمل بذات خود عبادت ہے۔ (زجاجۃ صفحہ ۱۱ ج ۲)

اب جیسے مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اس سے مسجد کا تقدس مجروح ہوگا، وہ ہوگا یہ

ہوگا۔ یہ سب مفروضات ہیں اور ہم نے بڑے احترام سے عرض کیا اور دوبارہ عرض کریں گے کہ مفروضات پر قلعہ کی تعمیر مناسب نہیں۔ ایک تو یہ واقعہ ہے کہ نکاح کے جملہ شرکاء بہرطور مسلمان ہوتے ہیں۔ اچھے ہوں یا بُرے، نیک ہوں یا بد، انہیں کچھ نہ کچھ مسجد کے آداب کا علم ہوتا ہے۔ اور وہ ضرور لحاظ و خیال کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک شخص اس قسم کی احادیث کے حوالہ سے مسجد کے نکاح کی ترغیب دیتا اور اس طرف بار بار توجہ دلاتا ہے یا زیادہ سے زیادہ اپنی ذات کی حد تک مسجد کو اس طرح اہمیت دیتا ہے تو اسے یہ الزام دینا کہ وہ اس کو ضروری قرار دیتا ہے، ایک ایسی بات ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں افسوس یہ ہے کہ ایک دوسرے کے معاملہ میں زبان و قلم کی جس احتیاط کا شریعت ہم سے تقاضا کرتی ہے اس کو ہم لوگ بھول چکے ہیں اور ہم نے تقویٰ کا سارا انحصار محض چند عبادات میں سمجھ لیا ہے۔ اگر ہمارے سامنے "مفلس" کی وہ تعریف ہوتی جو حضور علیہ السلام نے کی اور جس میں حقوق العباد کے ضائع کرنے والے شب بیدار کی بے کسی و بے بسی کا صبح قیامت ذکر کیا تو شاید ہم احتیاط برتتے ــــــ

ڈاکٹر صاحب اگر کہتے ہیں کہ نکاح کے موقعہ پر کسی قسم کی دعوت طعام نہ ہو تو اس پر بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک ایسے والدین جن کے گھر میں بچی ہوتی ہے، انہیں بچی کے رشتے سے کہیں زیادہ بھاری بھرکم برات کے کھانے اور منہ مانگے جہیز کی فکر ہوتی ہے۔ حضور نبی کریم علیہ السلام نے خود متعدد نکاح کئے اپنی چار صاحبزادیوں کے نکاح کئے۔ ولیمہ کا ذکر تو موجود ہے۔ اور وہ بلاشبہ سنت ہے ہونا چاہیئے لیکن اس طرح کہ اس میں سارا لحاظ اہل ثروت عزیزوں اور احباب کا ہی نہ ہو بلکہ غرباء اور فقراء کو بھی شامل کیا جائے۔ باقی ایک حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کے علاوہ کسی دعوت و جہیز کا کم از کم مجھ جیسے حقیر اور کم مطالعہ انسان کو ثبوت نہیں ملا۔ میں نے امکانی حد تک کتب سیرت کو کھنگھالا۔ احادیث کے میسّر مجموعے دیکھے ایک اس بات کے علاوہ (یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا والی بات) کوئی بات نظر نہ آئی۔ اب ذہن میں ایک اور الجھن پیدا ہوئی کہ آخر یہ اہتمام محض ایک صاحبزادی کے لئے کیوں ہوا؟ باقی تین کے لئے کیوں نہ ہوا اور یہ کہ خود آپ کے نکاح ہوئے انہیں یہ اہتمام کہیں نظر نہیں آتا ــــــ ولیمہ آپ نے کیا کبھی بکری کے گوشت سے، کبھی جَو کے آٹے اور کھجور و پنیر سے، کبھی احباب کے توشہ دانوں میں موجود کھانا منگوا کر دسترخوان پر رکھ لیا اور فرمایا کہ اسے اپنے نبی کا ولیمہ سمجھ لو ــــــ صحابہ میں اس حد تک سادگی کا عنصر ہے کہ عشرہ مبشرہ کے صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نکاح کرتے

ہیں تو کسی برات واہتمام کے بغیر، حتیٰ کہ حضور علیہ السلام کو نہیں بلاتے، آپؐ بعد میں بعض علامات سے اندازہ لگاتے ہیں، یہاں یہ سب ہے وہاں حضرت علی اور فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نکاح کے وقت جہیز و دعوت جس میں شربت وغیرہ ہے، اس کا اہتمام کیوں ؟

اللہ تعالیٰ نے ذہن میں بات ڈالی بعض احباب اور مخلصین سے ذکر کیا۔ انہوں نے تائید کی کہ سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معاملہ محض داماد کا نہیں وہ بچپن سے حضور علیہ السلام کی خدمت میں ہیں۔ آپ ان کے سرپرست ہیں۔ گویا یہ چھوٹا موٹا اہتمام معروف معنوں میں بچّی والے نہیں کر رہے بلکہ گویا دولہا والے ہی کر رہے ہیں —— لطیفہ غیبی یہ ہے کہ مولانا نعمانی کے ایک نوٹ نے اس کی ایک حد تک تائید کی۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں عرب میں نکاح شادی کے موقع پر لڑکی کو "جہیز" کے طور پر کچھ سامان دینے کا رواج بلکہ تصور بھی نہیں تھا اور "جہیز" کا لفظ بھی استعمال نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانہ کی شادیوں میں کہیں اس کا ذکر نہیں آتا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علاوہ حضور علیہ السلام کی دوسری صاحبزادیوں کے نکاح کے سلسلہ میں بھی کہیں کسی قسم کے "جہیز" کا ذکر نہیں آیا۔ حدیث کے لفظ "جھّز" کے معنی اصطلاحی جہیز دینے کے نہیں بلکہ ضروریات کا انتظام اور بندوبست کرنے کے ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لئے حضور علیہ السلام نے ان چیزوں (چادر مشکیزہ وغیرہ) کا انتظام حضرت علی کے سرپرست ہونے کی حیثیت سے انہی کی طرف سے اور انہی کے پیسوں سے کیا تھا۔ کیونکہ یہ ضروری چیزیں ان کے گھر میں نہیں تھیں۔ روایات سے اس کی پوری تفصیل معلوم ہو جاتی ہے۔ (معارف الحدیث صہ ۲۹۔۳۰)

مولانا نعمانی مدظلہٗ نے بات بالکل واضح کر دی ہے۔ سید الملّۃ علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ خلیفہ مجاز حکیم الامت تھانوی قدس سرہ سے سن لیں۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں :

حضرت علیؓ نے خواہش (نکاح) کی تو آپؐ نے فرمایا تمہارے پاس مہر ادا کرنے کو کچھ ہے؟ بولے ایک گھوڑا اور زرہ کے سوا کچھ نہیں۔ فرمایا گھوڑا لڑائی کے لئے ضروری ہے۔ زرہ فروخت کر دو۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۴۸۰ درہم میں خرید لی اور حضرت علی نے قیمت لا کر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے ڈال دی۔ (یہ دلیل ہے کہ یہاں معاملہ سرپرستی کا تھا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ بازار سے خوشبو لائیں۔
(صفحہ ۲۲۸ ج ۲، سیرت النبی مطبوعہ اعظم گڑھ ایڈیشن ۱۳۷۵ھ)

ان بیانات سے جو ذمہ دار لوگوں کے ہیں سارا معاملہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کوئی برات لے کر نہیں گئے۔ نہ ہی حضور علیہ السلام نے کوئی دعوت بطور رخصتی کے والد کے کی۔ بلکہ آپؐ کا معاملہ حضرت علیؓ کی سرپرستی کا تھا جو ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اگر برات، جہیز اور رخصتی والوں کی دعوت کا کوئی مسئلہ ہوتا تو نبی پاک علیہ السلام کی باقی تین صاحبزادیوں کا بھی ذکر ہوتا اور کہیں سے تو اس کی بھنک پڑتی ــــ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہزار خواہش و کوشش کے باوصف ایسی بات نہ مل سکی جو دلیل ہے اس بات کی کہ ایسا نہ ہوتا تھا اور یہی بات اسلام کی سادگی سے مناسبت رکھتی ہے۔ چلتے چلتے ایک مزید حوالہ ملاحظہ فرمالیں:

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے زندہ خلیفہ جناب ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی نے "اسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم" کے نام سے ایک بہت ہی قابلِ قدر اور لائق مطالعہ کتاب لکھی جسے بڑی ہی قبولیت حاصل ہوئی اس میں "معاشرت" کے عنوان سے ایک مستقل باب ہے۔ صفحہ ۶۰۹ پر ایک عنوان ہے "نکاح کے بعض اعمال مسنونہ" ــــ اس میں یہ جملہ ہے:

"مسنون نکاح وہ ہے جو سادگی کے ساتھ ہو اور جس میں ہنگامہ اور نام و نمود کے لئے اسراف نہ ہو۔"

برات وغیرہ ساری باتوں کی بڑی خوبصورتی سے تردید سامنے آتی ہے ــــ مزید صفحہ ۶۱۱، ۶۱۲ پر سیدۃ فاطمہ سلام اللہ تعالیٰ علیہا و رضوانہ کی شادی کا بیان ہے۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خواہش پھر نبی کریم علیہ السلام کے ارشاد سے زرہ بیچنا، پھر انہی کے مال سے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعے خوشبو وغیرہ منگوانے کا ذکر ہے۔ مزید ہے:

اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ جاؤ ابوبکرؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، زبیرؓ اور چند انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بلا لاؤ۔ جب یہ لوگ آکر بیٹھ گئے تو آپؐ نے نکاح کا خطبہ پڑھا... الخ

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ غایت درجہ سادگی کے ساتھ بغیر برات وغیرہ محض چند احباب کو خود نبی کریم علیہ السلام نے شہادت و اعلان کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے

(بقیہ ص ۹۲ پر)

رفتارِ کار

امیرِ تنظیمِ اسلامی کا نوروزہ دورۂ بلوچستان

و

سہ روزہ علاقائی اجتماع صوبہ سندھ و بلوچستان

سید برھان علی

امیرِ محترم گذشتہ کئی سالوں سے مختلف اوقات میں کوئٹہ کا دورہ فرماتے رہے ہیں، آپ کا پہلا دورہ مئی ۱۹۸۲ء میں ہوا تھا۔ کوئٹہ کی تنظیم میں نو وارد رفقاء کی مناسب تربیت کے لیے ۵ اکتوبر تا ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۳ء ایک تربیت گاہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ سے کوئٹہ کے رفقاء شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہے تھے کہ گذشتہ سالوں میں تنظیم کی دعوت اہلیانِ کوئٹہ تک نہایت مؤثر انداز میں پہنچ رہی ہے۔ مختلف اوقات میں امیرِ محترم کے دورے اسی سلسلہ کی کڑی تھے۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ ایک قدم آگے بڑھا کر بلوچستان کے دیگر علاقوں تک دعوت کا دائرہ کار وسیع کیا جائے۔ علاوہ ازیں مختلف اوقات میں رفقاء کے مشوروں سے یہ نکتہ بھی سامنے آیا کہ رفقاء کی عملی تربیت کے لیے بھی کچھ انقلابی لائحہ عمل اختیار کیا جانا چاہیے۔ کوئی ایسا طریقۂ کار اختیار کیا جائے جس میں چند روز کے لیے گھربار اور دیگر مصروفیات سے قطع تعلق کر کے ہمہ تن اور ہمہ وقت اللہ کے راستے میں کام کیا جائے۔ چنانچہ مذکورہ بالا ہر دو وجوہات کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ کوئٹہ سے باہر نکل کر کچھ مقامات پر عملی کام کیا جائے تاکہ امیرِ محترم کے دوروں کے لیے راہ ہموار کی جا سکے۔ اسی جذبہ کے پیشِ نظر کوئٹہ کے رفقاء نے منصوبہ بندی کر کے ایک پروگرام ترتیب دیا اور ماہ رمضان المبارک کے اختتام کے فوراً بعد تمام رفقاء نے ٹولیوں کی صورت میں مختلف مقامات کے دورے شروع کیے۔ دو دو تین تین روز ہر شہر میں گذارے اور کام کیا۔ بعد ازاں امیرِ محترم کے دوروں کے لیے تین مقامات یعنی خضدار، لورالائی اور پشین کو منتخب کیا گیا۔ تینوں شہروں میں مختلف مکاتب فکر کے حضرات کے ساتھ ملاقاتیں کی گئیں اور متعلقہ حضرات سے امیرِ محترم کے دروس کے لیے اجازت حاصل کی۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ تنظیم اسلامی کے دسویں سالانہ اجتماع منعقدہ لاہور میں علاقائی اجتماعات کے انعقاد کے فیصلہ کے پیشِ نظر صوبہ بلوچستان میں علاقائی اجتماع ماہ ستمبر کے دوران طے پایا تھا۔ اسی

موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے امیر محترم سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ اجتماع سے متصل مندرجہ بالا تین مقامات کے دوروں کو بھی اپنے پروگرام میں شامل فرمالیں۔ اگرچہ رفقاء کو اس امر کا بھی احساس تھا کہ گذشتہ کئی ماہ سے امیر محترم کی طبیعت مسلسل خراب چل رہی ہے۔ لیکن اللہ کے دین کی سربلندی کی کٹھن جدوجہد میں جس طرح امیر محترم نے اپنی جان کو کھپا رکھا ہے۔ اور اس سلسلہ میں وہ اپنی علالت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ رفقاء کو یقین تھا کہ وہ اس درخواست کو قبول فرمالیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ امیر محترم نے مذکورہ دوروں اور علاقائی اجتماع کے لیے ۸ ستمبر تا ۱۶ ستمبر ۱۹۸۵ء کی تاریخوں کا تعین فرماکر رفقاء کوئٹہ کی انتہائی پذیرائی فرمائی۔

ملک کے دیگر حصوں کے قارئین کے لیے یہ امر شاید باعث تشنگی رہے اگر اس موقعہ کی مناسبت سے صوبہ بلوچستان اور منتخب کردہ مقامات کا مختصر پس منظر اور جائزہ پیش نہ کر دیا جائے۔ بلوچستان بہ لحاظ رقبہ پاکستان کا سب سے بڑا اور بہ لحاظ آبادی سب سے چھوٹا اور ایک پسماندہ صوبہ ہے۔ آبادی کئی اقوام پر مشتمل ہے اور پورا علاقہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ میں پختونوں کی آبادی ہے جبکہ دوسرا علاقہ بلوچ آبادی کا ہے اس کے مختلف شہر دور دراز فاصلوں پر واقع ہیں۔ یہاں کے شہروں کی آبادی بھی قلیل ہے۔ پنجاب کے قصبات سے بھی بعض شہروں کی آبادی کم ہے۔ آبادی کا اکثر حصہ روائتی طور پر دین سے وابستہ ہے۔ ذرائع معاش محدود ہیں۔ پانی کی کمیابی کی وجہ سے زراعت بھی محدود ہے اور صنعت و حرفت بھی نہ ہونے کے برابر۔ ناخواندگی کی شرح بہت زیادہ ہے۔ غربت و افلاس کی بھی زیادتی ہے۔

خضدار:۔ یہ شہر کوئٹہ کے بعد بلوچستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ فوجی چھاؤنی بھی ہے۔ کوئٹہ سے جنوب میں آر سی ڈی شاہراہ پر تقریباً ۳۵۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر کراچی اور کوئٹہ کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ بلوچ آبادی کا شہر ہے اور قلات ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر ہے یہاں پر ایک انجینئرنگ کالج اور ائیرپورٹ زیر تعمیر ہیں۔ گذشتہ عشرہ سے اس شہر میں زبردست ترقیاتی کام ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے اس شہر کو کافی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اور یہ مقام صوبہ کے دوسرے نمبر پر آگیا ہے۔

ماہ جولائی کے دوران کوئٹہ کے رفقاء کے ایک گروپ نے اس شہر کا تین روزہ دورہ کیا اور امیر محترم کے مجوزہ دورہ کے سلسلہ میں یہاں پر کام کیا۔ ہمیں یہاں پر بعض مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ شہر کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب صاحب نے امیر محترم کے درس قرآن کے لیے اپنی مسجد کے استعمال سے معذوری کا اظہار فرمایا۔ دوسری بڑی جامع مسجد خضدار کالونی میں واقع ہے جس کے خطیب حضرت مولانا احمد شاہ صاحب ہیں۔ انتہائی پرخلوص انسان ہیں۔ شریعت کورٹ کے ممبر بھی ہیں۔ جس روز ان سے رابطہ کیا اتفاق سے اُسی روز حج پر تشریف لے جا رہے تھے۔ انہوں نے ازراہ کرم امیر محترم

کے پروگرام اپنی مسجد میں منعقد کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اپنے نائب خطیب صاحب کو بھی اس سلسلہ میں ہدایات عطا فرمائیں علاوہ ازیں نماز جمعہ سے قبل اسی مسجد میں ہمارے رفیق جناب عبدالواحد خان کو سورہ صف کے درس کی بھی اجازت عنایت فرمائی۔ شہر کے کچھ اور اہل علم حضرات سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ امیر محترم اور تنظیم اسلامی کا تعارف بھی کرایا گیا۔ مختلف حضرات سے تعاون کی یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد یہ گروپ واپس کوئٹہ پہنچا۔ چونکہ امیر محترم کے دورہ خضدار کی تاریخ ۹ ستمبر مقرر ہوئی تھی۔ لہذا کوئٹہ سے پانچ رفقاء کا ایک گروپ رفیق محترم عبدالواحد خانصاحب کی سرکردگی میں دوبارہ ۷ ستمبر کو عازم خضدار ہوا۔ جہاں پر انہوں نے اہم مقامات پر بینرز آویزاں کیے پوسٹر چسپاں کیے اور ہینڈ بلز تقسیم کیے۔ نیز علاقہ کے لوگوں سے ملاقاتیں شروع کیں۔ وہاں پہنچنے پر محسوس ہوا کہ حالات کچھ مختلف ہیں اور مخالفت کا سامنا ہے۔ درس کے لیے متعین مسجد کے نائب خطیب صاحب بھی کچھ زیادہ معاون ثابت نہیں ہو رہے تھے۔ امیر محترم کی شب گذاری کے لیے مناسب جگہ کا بندوبست بھی طے نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن مسلسل تگ و دو اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے سبب رفتہ رفتہ تمام رکاوٹیں دور ہوتی چلی گئیں۔ خضدار شہر سے باہر شاہراہ پر ایک پٹرول پمپ ہے جس کے مالک جناب عزیز احمد شاہوانی ہیں ان کے علم میں جب امیر محترم کے دورہ کا پروگرام آیا تو انہوں نے از خود ہمارے ساتھیوں سے رابطہ قائم کر کے امیر محترم کے لیے میزبانی کی خواہش کا اظہار فرمایا اور اللہ کریم کی نصرت سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ اس سلسلہ میں ہم موصوف کے انتہائی شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اللہ کے دین کے کام کے سلسلہ میں جس پرخلوص طریقہ پر تعاون فرمایا یہ ان کا ہی حصہ ہے ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی انکا تعاون ہمیں حاصل رہے گا۔

امیر محترم کوئٹہ سے صبح سات بجے جناب میاں محمد نعیم امیر تنظیم، کوئٹہ کے ہمراہ خضدار کے لیے بذریعہ کار روانہ ہوئے۔ اور ایک بجے خضدار پہنچے۔ جہاں پر آپ نے بعد نماز مغرب "دینی فرائض کا جامع تصور" کے موضوع پر سورۃ البلد کے حوالہ سے دلنشیں انداز میں خطاب فرمایا۔ حاضرین کی تعداد کا اندازہ چار سو کے لگ بھگ تھا۔ سامعین نے ذوق و شوق کے ساتھ پروگرام میں شرکت فرمائی اور مجموعی طور پر خضدار کا یہ پہلا دورہ کامیاب رہا۔

لورالائی

امیر محترم اگلے روز دس ستمبر کی صبح خضدار سے روانہ ہو کر کوئٹہ واپس پہنچے۔ اور ۱۱ ستمبر کی صبح بذریعہ کار لورالائی صوبہ بلوچستان کا ایک قدیم ضلع ہے اور کوئٹہ سے شمال مشرق میں تقریباً ۲۷۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر پشتون آبادی کا ایک شہر ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ کاکڑ پٹھانوں پر مشتمل ہے اہالیان پنجاب کی بھی اچھی خاصی تعداد کاروبار اور ملازمتوں سے وابستہ ہونے کی بناء پر یہاں آباد ہے۔ ماہ جولائی ۱۹۸۵ء کے دوران

چار رفقاء کے گروپ نے اس شہر کا تین روزہ دورہ کیا تھا۔ امیر محترم کے متوقع دورہ کے انتظامات کا جائزہ لیا اور مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے افراد سے رابطے قائم کیے شہر کی مرکزی جامع مسجد کی کمیٹی کے صدر جناب خواجہ محمد لطیف صاحب نے ازراہِ عنایت امیر محترم کے درس کی اجازت عنایت فرمائی اور مکمل تعاون فرمایا۔ چھاؤنی کے علاقہ کی ایک مسجد میں رفیق محترم عبدالواحد خانصاحب نے سورۂ صف کا درس بھی دیا جس میں کافی تعداد میں سول اور آرمی کے حضرات نے شرکت کی اور نہ صرف عام لوگوں نے بلکہ مسجد کے پیش امام صاحب نے بھی درس کو سراہا۔ لورالائی کے لیے امیر محترم کے دورہ کی تاریخ ۱۱ ستمبر مقرر ہوئی تھی۔ چنانچہ دورہ کے انتظامات کے سلسلہ میں چار رفقاء کا ایک گروپ رفیق محترم جناب اکرام الحق صاحب کی سرکردگی میں ۹ ستمبر کو لورالائی روانہ ہوا۔ جہاں انہوں نے اہم مقامات پر بینرز آویزاں کیے۔ اشتہار چسپاں کیے اور ہینڈ بلز تقسیم کیے۔ نیز شہر میں مختلف حلقوں میں رابطے قائم کیے اور علاقائیں کیں لورالائی کے انتظامات میں کوئی قابل ذکر دشواری پیش نہیں ہوئی جسکی خصوصی وجہ یہ ہے کہ لورالائی میں ایک صاحب جناب افتخار احمد جو تنظیم کی دعوت اور کام سے متفق تھے۔ اپنے رفقاء کے ہمراہ کافی دنوں سے وہاں کام کر رہے تھے اور انہوں نے وہاں پر ایک حلقہ قائم کر رکھا تھا۔ انہوں نے وہاں پر اس سلسلہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس دورہ میں امیر محترم کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر اقامت دین کی جدوجہد کے لیے اس قافلہ میں باقاعدہ شمولیت بھی اختیار فرمائی ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ دیگر شہروں کے مقابلہ میں لورالائی میں امیر محترم کا تعارف بھی نسبتاً کچھ زیادہ تھا۔ امیر محترم اور ہمارے رفقاء کے قیام وطعام کا بندوبست بھی جناب افتخار صاحب نے ہی اپنے ایک رفیق کی رہائش گاہ پر فرمایا۔ ۱۱ ستمبر بعد نماز مغرب لورالائی کی مرکزی جامع مسجد میں امیر محترم نے اپنے مخصوص اور پُراثر انداز میں "دینی فرائض کا جامع تصور" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ خضدار اور لورالائی دونوں مقامات پر امیر محترم نے مذکورہ بالا موضوع کی مناسبت سے اپنے خطاب میں اس امر پر زور دیا کہ درحقیقت مسلمانوں کی کامیابی و فلاح اسی نکتہ میں مضمر ہے کہ وہ خود اللہ کے احکامات کے تحت اپنی زندگیوں کو ڈھالیں۔ دین کے احکامات دوسروں تک پہنچائیں۔ اور اقامت دین کی جدوجہد میں جان۔ مال اور اوقات کھپائیں۔ آپ نے فرمایا کہ چونکہ پاکستان کا مقام ایک مخصوص دینی نظریہ اور عہد کی بنا پر عمل میں آیا تھا۔ لہٰذا اُسکی بقاء بھی اُس عہد کی پابندی سے وابستہ ہے۔ قمری حساب سے پاکستان اب چالیس برس کی عمر کو پہنچ چکا ہے۔ ہم نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اُسکو آج تک پورا نہیں کیا جسکی پاداش میں اللہ کے عذاب کا ایک کوڑا مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں ہم پر برس چکا ہے اور اب بھی اگر ہم نے اپنے عہد کی خلاف ورزی جاری رکھی اور ہم متنبہ نہ ہوئے تو نہ معلوم کہ آئندہ ہمارا کیا حشر ہو؟ اور کہیں اس مملکت خداداد کا وجود ہی خطرہ میں نہ پڑ جائے۔ درس میں عوام کی کثیر تعداد نے شرکت کی جس سے اندازہ ہوا کہ یہاں کے لوگوں میں دوسرے مقامات کی نسبت زیادہ پیاس اور طلب تھی۔ اسی وجہ سے لوگوں نے نہایت ذوق وشوق اور جمعی

سے درس سے استفادہ کیا۔ امیر محترم کی کُتب اور کیسٹ بھی کثیر تعداد میں فروخت ہوئیں اور اس طرح لورالائی کا یہ پہلا دورہ ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر کامیاب ہوا۔

پشین

امیر محترم لورالائی سے ۱۲ ستمبر کی صبح روانہ ہو کر شام ۵ بجے پشین پہنچے۔ پشین پشتون آبادی پر مشتمل کوئٹہ سے میں تقریباً ۵۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر چمن روڈ سے ذرا ہٹ کر واقع ہے۔ چھوٹا سا شہر ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ سادات نیز کاکڑ اور ترین قبائل پر مشتمل ہے۔ چند سال قبل اس شہر کو ضلع کا درجہ دیا گیا۔ قبل ازیں ضلع کوئٹہ میں شامل تھا۔ اکثریت دینی ذہن رکھنے والی اور پُرانی روایات کی پابند ہے۔ سیاسی طور پر جمعیت العلماء اسلام کا زیادہ اثر ہے۔ ماہ جولائی کے دوران رفقاء کے ایک گروپ نے اس شہر کا دورہ کیا تھا۔ اور ایک رات یہاں قیام کیا تھا جس کے دوران شہر کے مختلف افراد سے ملاقاتیں کیں۔ شہر کی مرکزی جامع مسجد میں ہمارے رفیق عبدالواحد خانصاحب نے سورۂ صف کا درس بھی دیا۔ مسجد کے خطیب حضرت مولانا محمد طاہر خانصاحب نے از راہِ کرم اپنی مسجد میں امیر محترم کے درس کی منظوری دی اور مکمل تعاون کا یقین دلایا بلکہ وعدہ بھی فرمایا کہ وہ خود لوگوں تک اس بات کو پہنچائیں گے۔ ہم اُن کے اس دینی جذبہ و تعاون کے لیے حقیقتاً شکر گزار ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ قرآن کی دعوت عام کرنے کے سلسلہ میں انکا یہ تعاون آئندہ بھی جاری رہے گا۔ بلوچستان اسمبلی کے ایک ممبر جناب سردار خیر محمد ترین نے اپنی رہائش گاہ پر ایک خصوصی نشست کے اہتمام کی خواہش ظاہر کی۔ پشین کے جناب حاجی عبدالرحیم خاکسار و حاجی نصراللہ خاں صاحب خاکسار جو کہ دونوں بھائی ہیں نے بھی اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا جس کے لیے ہم اُن کے انتہائی شکر گزار ہیں چونکہ اس دورہ کے وقت پشین کے دورہ کی تاریخ کا تعین نہیں ہوا تھا لہٰذا امیرِ تنظیم کوئٹہ جناب میاں محمد نعیم صاحب اور راقم الحروف نے ماہ اگست کے اواخر میں دوبارہ پشین کا دورہ کیا اور جناب سردار خیر محمد ترین صاحب ایم پی اے اور حضرت مولانا محمد طاہر صاحب سے ملاقات کر کے ۱۲ ستمبر کا پروگرام طے کیا۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۸۵ء کو راقم الحروف کی سرکردگی میں چار رفقاء کا ایک گروپ پشین پہنچا۔ اہم مقامات پر بینر آویزاں کیے۔ اشتہار چسپاں کیے اور ہینڈ بلز تقسیم کیے۔ نیز درس کے لیے متعین مسجد میں ہی قیام کیا۔ مسجد کے خطیب حضرت مولانا محمد طاہر صاحب نے درس میں شرکت سے معذوری ظاہر فرمائی۔ کیونکہ ان کو ۱۱ ستمبر کو اپنے چچا کے استقبال کے لیے کوئٹہ جانا تھا جو کہ حج بیت اللہ سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ اُن کی غیر موجودگی میں ہمارے لیے بعض مشکلات پیدا ہوئیں۔ لیکن خوش قسمتی سے مولانا اس وقت تک کوئٹہ کے لیے روانہ نہ ہوئے۔ ان کے تعاون سے اللہ تعالیٰ نے ان مشکلات کو رفع کرنے کی سبیل پیدا کی۔

علاوہ ازیں جناب سردار خیر محمد ترین صاحب ایم پی اے بھی پشین میں موجود نہیں تھے اور بعض وجوہات

کی بناء پر وہ ۱۲ ستمبر کی دوپہر تک واپس پشین نہ پہنچے شہر میں بھی جابجا کچھ غلط فہمی کی بناء پر مخالفت کا سامنا کرنا پڑا گالیاں بھی سنیں اور دھمکیاں بھی سہیں۔ ایک لمحہ تو ایسا بھی آیا جب راقم الحروف کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ پشین کا پروگرام نہ ہو سکے گا لیکن اپنے مولا سے دعائیں کرتے ہوئے کام کو جاری رکھا اور تائید ایزدی ہمارے شامل حال رہی۔ اس سلسلہ میں محترم حاجی عبدالرحیم صاحب خاکسار کے فرزند جناب عبدالحکیم نے جس بھرپور انداز میں تعاون فرمایا اسکا اعتراف نہ کرنا یقیناً زیادتی ہوگی۔ خصوصی طور پر راقم الحروف انکا انتہائی شکرگزار ہے کہ انہوں نے اللہ کے دین کے راستہ میں بھرپور جدوجہد فرمائی بلکہ ہماری دلی خواہش ہے کہ وہ تنظیم اسلامی میں شمولیت فرما کر پشین میں خدمت و دعوت دین کے لیے جدوجہد کریں۔

امیر محترم نے بعد نماز عصر نہایت جامع اور سادہ انداز میں سورۃ العصر کا درس دیا جو نماز مغرب تک جاری رہا۔ حقوق کے بیان کے ضمن میں آپ نے اس امر کو واضح کیا کہ چونکہ زمین اللہ کی ہے۔ لہٰذا یہ اس کا حق ہے کہ اُس کی زمین پر اسی کا نظام نافذ ہو۔ تین سو کے لگ بھگ سامعین نے نہایت اطمینان اور دلجمعی سے درس سُنا اور بعد نماز مغرب سوال و جواب کی محفل بھی منعقد ہوئی۔ جس کے اختتام پر امیر محترم نے جناب حاجی عبدالرحیم خاکسار کی رہائش گاہ پر ماحضر تناول فرمایا اور رات ساڑھے دس بجے کوئٹہ واپس پہنچے اور یوں انتہائی رکاوٹوں کے باوجود پشین کا یہ پہلا دورہ بھی توقعات کے برعکس کامیاب رہا۔

بیرون کوئٹہ روانگی سے قبل ۸ ستمبر کو کوئٹہ پہنچنے کے کچھ دیر بعد امیر محترم نے بعد نماز مغرب سیٹلائٹ ٹاؤن کوئٹہ کی سینٹرل گورنمنٹ سرونٹس کالونی کے کمیونٹی سنٹر میں "جہاد بالقرآن" کے موضوع پر خطاب فرمایا تھا جس میں علاقہ کے تقریباً تین سو اہل علم حضرات نے شرکت فرمائی اور امیر محترم کے خطاب سے مستفید ہوئے اور یہ خطاب سے مستفید ہوئے اور یہ خطاب کامیاب رہا۔

مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۸۵ء کو امیر محترم نے کوئٹہ چھاؤنی کی جامع مسجد ڈیری فارم میں نماز جُمعہ سے قبل "توحید عملی" کے موضوع پر نہایت مدلل اور جامع خطاب فرمایا جو ساڑھے بارہ بجے سے دو بجے تک جاری رہا۔ جسمیں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ ۱۱ بجے سے ہی شہر اور چھاؤنی سے سول اور آرمی کے لوگ جوق در جوق مسجد میں پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ اور مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھر گئی تھی۔ عید کا سا سماں تھا۔ یہاں پر بھی امیر محترم کی کتب کافی تعداد میں فروخت ہوئیں جن میں "توحید عملی" نامی کتاب کی فروخت نمایاں تھی۔

مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۸۵ء کو امیر محترم نے اسلامیہ ہائی سکول میں خواتین کے ایک خصوصی اجتماع سے "اسلام میں خواتین کے حقوق اور انکی دینی و ملی ذمہ داریوں" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

مورخہ ۱۳ ستمبر و ۱۴ ستمبر ۱۹۸۵ء کو امیر محترم نے جامع مسجد طوبیٰ میں روزانہ بعد نماز مغرب "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا، کیوں اور کیسے" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ اور تفصیل سے انقلاب کی تعریف ...

مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۸۵ء کو جامع مسجد طوبیٰ میں ہی سوال و جواب کی نشست بھی منعقد ہوئی جس میں کافی حد تک معیاری سوالات کیے گئے جن کے جوابات امیر محترم نے تفصیل کے ساتھ عنایت فرمائے جن سے سائلین و سامعین مطمئن نظر آتے تھے۔

مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۸۵ء کو تنظیم اسلامی کا علاقائی تنظیمی و تربیتی اجتماع اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ میں شروع ہوا۔ جو ۱۶ ستمبر تک جاری رہا جس میں قیم تنظیم اسلامی جناب چوہدری غلام محمد صاحب، جناب عبدالرزاق صاحب جناب عبدالواحد خان صاحب نے منتخب نصاب نمبر ۲ کی روشنی میں تنظیمی و تربیتی امور پر گفتگو فرمائی۔ امیر محترم نے بھی پہلے دو دن خطاب فرمایا۔ اور اپنی دینی فکر کے ماخذ بیان فرمائے۔

۱۶ ستمبر ۱۹۸۵ء کو جناب شیخ جمیل الرحمٰن نے امیر محترم کے نمائندہ کی حیثیت سے اجتماع سے اختتامی خطاب فرمایا۔ اور اس طرح یہ اجتماع اختتام پذیر ہوا۔ مذکورہ اجتماع میں مختلف مقامات سے کافی رفقاء نے شرکت فرمائی ـــــ تمام رفقاء کے قیام و طعام کا بندوبست مکمل طور پر تنظیم اسلامی کوئٹہ کی جانب سے اسلامیہ ہائی سکول میں کیا گیا تھا۔ امیر محترم نے رفقاء کو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ وہ یکسو ہو کر اجتماع میں شرکت کریں اور اپنے ذاتی کاموں کو اجتماع کے اختتام تک موقوف رکھیں چنانچہ اسی وجہ سے کوئٹہ تنظیم نے ۱۶ ستمبر کی بجائے ۱۸ ستمبر تک تمام رفقاء کے قیام و طعام کا بندوبست کیا تاکہ رفقاء اجتماع سے فارغ ہو کر اگر کوئٹہ میں اپنے کوئی کام کرنا چاہیں یا گھومنا پھرنا چاہیں تو ان کو قیام و طعام کی تکلیف نہ ہو۔ اس سلسلہ میں اسلامیہ ہائی سکول کی انتظامیہ اور خصوصی طور پر سکول کے ہیڈ ماسٹر جناب محمد یوسف بھٹی صاحب اور اُن کے دیگر رفقاء کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اجتماع کے دوران اپنے سکول کے استعمال کی پرخلوص پیشکش کی بلکہ عملی طور پر اُس سے بھی زیادہ اخلاص کا ثبوت دیا اور بھرپور تعاون فرمایا۔ اللہ کے دین کی خدمت کے لیے اُن کے اس عمل کا اجر یقیناً اُن کے رب کے پاس محفوظ رہے گا۔

دراصل اسلامیہ سکول کے ساتھ امیر محترم کا ایک دیرینہ تعلق بھی ہے کوئٹہ میں امیر محترم نے ۱۹۷۵ء میں ایک دس روزہ تربیت گاہ اسی سکول میں منعقد کی تھی، جناب بھٹی صاحب نے امیر محترم کو دعوت دی کہ وہ سکول کے طلباء کو بھی اپنے خطاب سے مستفید فرمائیں۔ چنانچہ ۱۶ ستمبر کو صبح امیر محترم نے بیس منٹ کے لیے طلباء سے خطاب فرمایا۔ دیگر نصائح کے علاوہ امیر محترم نے طلباء کو خصوصی تلقین فرمائی کہ وہ عربی کی تعلیم ضرور حاصل کریں تاکہ وہ قرآن کو بہتر طور پر سمجھ کر اپنی آئندہ زندگی میں مختلف حیثیتوں سے دین کی بہتر خدمت کر سکیں اور غیر مسلم دنیا کے ماہرین کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ امیر محترم نے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" نامی کتابچہ کی ایک سو کاپیاں بھی تحفہ کے طور پر سکول کو ارسال کرنے کی ہدایت فرمائی۔ تاکہ خصوصی طور پر ہائی سکول کے طلباء اس کے مطالعہ سے مستفید ہو سکیں۔ اُسی روز ۹ بجے صبح کوئٹہ تنظیم کے رفقاء کا ایک خصوصی اجلاس امیر محترم نے طلب فرمایا چونکہ میاں محمد نعیم صاحب نائب امیر تنظیم کی حیثیت سے اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے

اگلے ماہ مرکز روانہ ہو رہے ہیں۔ لہٰذا کوئٹہ تنظیم کی امارت کے لیے امیر محترم نے جناب عبدالواحد خان کی نامزدگی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان دونوں ساتھیوں کو اپنی نئی ذمہ داریوں سے احسن طریق پر عہدہ برآ ہونیکی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ بعدازاں جو حضرات تنظیم اسلامی میں شمولیت کا فیصلہ کر چکے تھے ان سے بیعت لی گئی۔ کوئٹہ میں کل آٹھ افراد نے جن میں سے ایک کا تعلق کراچی۔ ایک کا صادق آباد سے ہے اور بقیہ چھ کوئٹہ کے رہنے والے ہیں۔ امیر محترم کا دستِ مبارک تھام کر اقامتِ دین جیسی دشوار اور کٹھن راہ پر گامزن ہونے کا عہد کیا۔ انہوں نے تجدید ایمان۔ توبہ۔ تجدید عہد کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کرنے کا عہد کیا۔ ہم اُن کے حق میں اللہ تعالیٰ سے استقامت طلب کرتے ہیں۔ دس بجے امیر محترم ایئرپورٹ روانہ ہوئے جہاں سے وہ لاہور کے لیے عازم سفر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ حسب سابق اس مرتبہ بھی میزبانی کا شرف کوئٹہ میں قیام کے دوران جناب چوہدری محمد یوسف صاحب ہی کو حاصل رہا۔

رفقاء تنظیم اسلامی کوئٹہ کے لیے یہ امر انتہائی باعث فخر و مسرت ہے کہ امیر محترم نے اپنے حالیہ دورہ بلوچستان کو بے حد کامیاب قرار دیا۔ اور کوئٹہ کے رفقاء کو اس دورہ کی کامیابی کے لیے منظم انداز میں محنت اور جدوجہد کرنے پر مبارکباد دی۔ امیر محترم نے فرمایا کہ خضدار، لورالائی اور پشین کے دورے کے سلسلہ میں کوئٹہ کے رفقاء نے جس انداز میں کام کیا وہ تنظیم کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا ہے جو دوسروں کے لیے قابل تقلید ہے یہ واقعہ ہے کہ نہایت نامساعد حالات میں کوئٹہ کے رفقاء کی قلیل تعداد (صرف ۱۳ رفقاء) نے لاتعداد رکاوٹوں کو عبور کر کے امیر محترم کے دورے اور اجتماع کو ممکن بنایا۔ ہمارے رفقاء نے اپنے رب سے دعائیں کیں اور سخت محنت اور خلوص کے ساتھ کام کیا اسی لیے رب العزت کی امداد اُن کے شامل حال رہی اور تمام رکاوٹیں خود بخود دور ہوتی چلی گئیں۔ اس دوران اُن کو گالیاں بھی سُننا پڑیں لیکن صبر و استقامت اور حکمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

چنانچہ اللہ نے اُنکو اُنکے مقصد میں کامیابی عطا فرمائی۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ ہمارے دیگر شہروں کے رفقاء بھی انقلابی انداز میں دعوت کو پھیلانے کے لیے باہر نکلیں ہم نے محسوس کیا کہ جو تربیت ہماری فیلڈ میں جاکر ہوئی وہ ایک جگہ بیٹھے رہنے سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ہمیں اس تجربہ سے ایک نیا حوصلہ اور ولولہ ملا ہے اور اُمید ہے کہ اب ہم اپنے دین کی سربلندی کی جدوجہد میں ایک نئے جذبہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے استقامت طلب کرتے ہوئے مزید آگے قدم بڑھائیں گے۔

کی غرض سے بلوالیا اور بس۔

اس کے ساتھ ہی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند اور اس سے نسبت و تعلق رکھنے والے ایک ایک فرد کے خادم و نیازمند کے طور پر بندۂ ناچیز نہایت درجہ احترام سے عرض کرے گا کہ اس نے محض تقاضائے عدل پورا کرنے کی غرض سے یہ سطور لکھیں۔ مقصد صرف حقیقت شناسی اور اس کی طرف توجہ ہے۔ امید کہ میرے بزرگ، اور مخلصین میرے جذبات اور نیتِ خیر کا لحاظ کرتے کرتے ہوئے اسی نقطہ نظر سے اس پر غور فرمائیں گے۔

واللہ ما اقول وکیل —— ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وماتوفیقی الا باللہ !!

نظر و دھوپ کی عینکوں کا مرکز

العزیز آپٹیکل کمپنی

یہاں آنکھوں کا معائنہ ڈاکٹر تعلیم یافتہ آنکھوں کے سپیشلسٹ کرتے ہیں۔ جدید امریکن مشین کا بھی انتظام ہے

فیس معائنہ ۲۰ روپے ◐ بوقت ۴½ بجے شام

العزیز بلڈنگ ۲-اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ٹینٹ اور ترپال

بنانے کا
ممتاز ادارہ

ایچ نظام دین اینڈ سنز

مرکزی دفتر

محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

ماہنامہ سیّارہ ڈائجسٹ لاہور

سے ڈاکٹر اسرار احمد کا انٹرویو

ماہنامہ "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور میں راقم الحروف کا ایک طویل انٹرویو چھپا ہے جس کا من وعن عکس قارئین "میثاق" کی خدمت میں ہدیہ کیا جا رہا ہے۔

اس انٹرویو کے ضمن میں راقم کیساتھ یکبار پھر وہی حادثہ ہوا ہے جو تین سال قبل روزنامہ "جنگ" لاہور کے مستقل مضمون نگار جناب ارشاد احمد حقّانی کے بارے میں ہوا تھا کہ جب انہوں نے فون پر وقت مانگا تھا تو میرا خیال یہ ہرگز نہیں تھا کہ یہ کسی انٹرویو کے لئے ہے بلکہ میں اس خیال میں تھا کہ یہ سابقہ جماعتی تعلق کے حوالے سے محض مشفقانہ ملاقات (COURTESY VISIT) ہے۔ بالکل اسی طرح جب ملک سفیان آفاقی صاحب کا فون آیا تو اس پر بھی وہی گمان ہوا کہ "حلقۂ ادبِ اسلامی" کے قدیم ترین وابستگان میں سے ایک سے مل کر بہت خوش ہوں گے اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ اب وہ کن وادیوں میں سرگرداں ہیں ——— بقول شاعر ؎

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جان !!!

میری لاعلمی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ وہ اب فلموں کے سٹوری رائٹر ہیں ——— بہرحال وہ آئے تو معلوم ہوا کہ حال ہی میں انہوں نے "سیارہ ڈائجسٹ" کی ادارت سنبھالی ہے اور اس کے لئے انٹرویو درکار ہے:

طبع شدہ انٹرویو میں کتابت کی فاش غلطیاں تو ہیں ہی کہ "مکتب" کو "مکتبہ" بنا دیا گیا بعض مقامات میں میرے مفہوم کی ادائیگی بھی صحیح نہیں ہے ——— تاہم اس وقت ان تفاصیل سے قطع نظر صرف ایک بات کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ:

"راقم نے اس انٹرویو میں بھی اور اس سے قبل بھی علماء کی تنظیموں کے بارے میں جو یہ رائے ظاہر کی ہے کہ وہ دوسری عظیم تر سیاسی تحریکوں کے ضمیمے بن کر رہ گئے ہیں تو اس میں حاشا وکلا علماء کی نیّت زیرِ بحث نہیں ہے ——— بلکہ برِعظیم کی ماضی قریب کی تاریخ میں نتائج کے اعتبار سے جو صورتِ واقعہ بن گئی اس کی جانب اشارہ ہے۔ ورنہ علماءِ کرام کی تنظیمیں خصوصاً جمعیت العلماءِ ہند ایک مستقل نظام اور مستقل پروگرام رکھنے والی تنظیم تھی اور اس نے کبھی اپنے آپ کو کسی کا ضمیمہ نہیں بنایا ———"

خاکسار، اسرار احمد

وہ عالم ہیں مگر علماء انہیں اپنی صفوں
سے باہر سمجھتے ہیں۔
درسِ قرآن دیتے ہیں مگر خطیب نہیں ہیں،
تقریریں کرتے ہیں مگر۔
نہ مقرر ہیں نہ سیاست داں،
تحریر پر قدرت ہے مگر اہلِ قلم کی برادری سے
باہر ہیں۔
ڈاکٹر ہیں مگر نسخے نہیں لکھتے۔

یہ متنازعہ شخصیت ڈاکٹر اسرار احمد ہیں

انٹرویو
علی سُفیان آفاقی

سماجی اور معاشرتی انقلاب ان کا نصب العین ہے اور
اسلامی نظام کا قیام منزلِ آخر
مجلسِ شوریٰ کے رُکن نامزد ہوئے
مگر مختاری کی تہمت نہ اٹھا سکے اور مستعفی ہو گئے
اپنی صاف گوئی اور بے باکی کے لیے بدنام ہیں
اسی کی پاداش میں ریڈیو اور ٹی وی کے دروازے ان پر بند ہو گئے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

ڈاکٹر اسرار احمد

ٹیلی فون کیا تو ایک آواز نے شائستگی کے ساتھ نام دریافت کیا۔ دو چند لمحے بعد ڈاکٹر اسرار بذاتِ خود فون پر تھے۔ میں نے اپنا نام بتایا۔ کہنے لگے: "اوہو۔ یہ نام تو بہت پرانا ہے۔ جس زمانے میں ہم پڑھا کرتے تھے اس وقت سے یہ نام سن رہے ہیں۔"

عرض کیا: "ڈاکٹر صاحب۔ نام ضرور پرانا ہے مگر آدمی پرانا نہیں ہے۔"

پوچھنے لگے: "آجکل کہاں ہوتے ہیں۔ کیا کر رہے ہیں؟"

ہم نے اپنے بارے میں مختصر کوائف فراہم کئے۔ "فرمایئے۔ کیسے یاد فرمایا؟"

ملاقات کی خواہش ظاہر کرنے پر کہنے لگے: "ممکن ہو تو اسی وقت آجایئے۔ رات کو سوا آٹھ بجے مجھے ایک تقریب پر جانا ہے اور کل صبح اسلام آباد روانگی ہے۔"

میری دوسری فوری مصروفیات تھیں۔ چنانچہ دو دن بعد اسلام آباد سے واپسی کے بعد نمازِ عصر اور مغرب کے مابین ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔

ہم وقتِ مقررہ پر قرآن اکیڈمی کی بلند و بالا زیرِ تکمیل عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ بتایا گیا ڈاکٹر صاحب کی طبیعت ناساز ہے آرام کر رہے ہیں۔ نمازِ عصر ادا کرنے مسجد میں بھی نہیں آئے۔ اندر پیغام بھجوانے کی کوشش کی۔ پیغام بر نے آکر اطلاع دی کہ میں

نے ایک ذمہ دار شخص کو خبر کر دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بیدار ہوں گے تو آپ کی خبر دے دی جائے گی۔ ہم نے ایک کاغذ پر اپنا نام اور ٹیلی فون نمبر لکھا اور قاصد کے حوالے کرتے ہوئے درخواست کی کہ جس وقت ڈاکٹر صاحب بیدار ہوں انہیں یہ کاغذ دے دیا جائے۔ ہم گھر پر ان کے فون کے منتظر ہیں۔ گھر پہنچ کر فون کا انتظار شروع ہوا۔ مغرب کا وقت گزر گیا مگر کوئی فون نہیں موصول ہوا۔ آخر ایک بار پھر فون پر رابطہ قائم کیا۔ اس بار تنظیم اسلامی کے ناظم سے گفتگو ہوئی۔ شکایتاً کہنے لگے: "آپ کہاں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔" ہم نے روداد سنائی۔ چند لمحے بعد انہوں نے اطلاع دی کہ مناسب ہو تو آپ اسی وقت آ جائیے۔ ہم دوبارہ قرآن اکیڈمی پہنچ گئے۔ اس بار ناظم صاحب نے پذیرائی کی اور ڈاکٹر صاحب کے دفتر تک راہنمائی بھی فرمائی۔

ڈاکٹر اسرار احمد سفید کرتے اور شلوار میں ملبوس اپنی مخصوص ٹوپی سر پہ رکھے ایک بڑی میز کے سامنے تشریف فرما تھے۔ کمرے میں فرنیچر کرسیوں اور ایک گلوب کے سوا کوئی اور سامانِ آرائش موجود نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کچھ مضمحل نظر آ رہے تھے۔ مزاج پرسی پر بتایا کہ اس وقت بھی ایک سو ڈگری بخار ہے۔ رات ہی اسلام آباد کے سفر سے واپس آئے ہیں اور ایک حادثہ یہ بھی گزرا کہ لاہور میں ان کی ہمشیرہ انتقال فرما گئی ہیں۔ سہ پہر کو ان کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر آئے ہیں۔

ہم نے اظہارِ تعزیت کیا اور ساتھ ہی معذرت بھی طلب کی: "مناسب ہو تو ملاقات کا کوئی اور وقت رکھ لیا جائے۔" کہنے لگے: "اب آپ آ ہی گئے ہیں تو کیا حرج ہے۔ ہم اپنی گفتگو کر لیتے ہیں۔"

میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ تھکن کے سوا کوئی اور علامت ان کے چہرے پر نظر نہیں آئی۔ وہ صبر و شکر کی تصویر بنے میرے سامنے موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ ابھی کچھ دیر پہلے اتنے بڑے جذباتی اور ذہنی صدمے سے گزرے ہیں۔ ان کی گفتگو نشست و برخاست، بلند اخلاقی اور رکھ رکھاؤ بالکل معمول کے مطابق تھا۔ فضا میں جو بوجھل پن پیدا ہو گیا تھا وہ انہوں نے چند لمحوں میں اپنے بے تکلفانہ انداز سے ختم کر دیا۔ کچھ دیر خالص ذاتی نوعیت کی بات چیت ہوئی، مگر پھر میں نے فوراً گفتگو کا رُخ انٹرویو کی طرف موڑ دیا۔ ڈاکٹر صاحب اس کے لیے بھی بالکل تیار تھے۔

میں نے دریافت کیا: "ڈاکٹر صاحب سیاست اور دین کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظریے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" ڈاکٹر اسرار نے بے تکان بولنا شروع کر دیا: "اسلام میں دین اور سیاست کی علیحدگی کا کوئی تصور موجود نہیں۔ ۲۰ ویں صدی کے آخری رُبع میں تو یہ خیال ایک عالمگیر تصور بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی پڑھا لکھا، باشعور مسلمان اس بات سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ مشکل یہ ہے کہ فی زمانہ سیاست کا لفظ مخصوص معنوں میں استعمال کیا جانے لگا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ انتخاب کے بعد حکومت کے حصول کی کوشش۔ یہ ایک وسیع اصطلاح ہے کہ حکومت کو سیاست کا اہم شعبہ سمجھا جاتا ہے اور بلاشبہ ایسا ہے بھی۔ لیکن اس سلسلے میں وضاحت طلب امر یہ ہے کہ سیاست دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک عملی سیاست اور دوسری نظری سیاست۔ نظری سیاست سے تو کوئی بھی باشعور مسلمان بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ ملک و ملت کے مسائل کے بارے میں اظہارِ رائے ہر باشعور شہری، بالخصوص مسلمان کا فرض ہے۔ البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص عملی سیاست میں بھی حصہ لے۔ میرے نزدیک سیاست کی دو اقسام ہیں۔ انقلابی سیاست اور انتخابی سیاست۔ اس میں فیصلہ کن چیز یہ ہوتی ہے کہ کسی بھی ملک میں جو سیاسی اور سماجی نظام قائم ہے آیا وہ بنیادی طور پر صحیح ہے یا نہیں؟ اور اگر اس میں خامیاں اور کوتاہیاں موجود ہیں تو وہ ثانوی درجے کی ہیں یا وہ نظام ہی غلط ہے؟ اگر پہلی رائے ہو تو انتخابی سیاست کے ذریعہ حکومت کی تبدیلی یا نظام کو چلانے والے ہاتھوں کی تبدیلی درست ہوگی اور اگر دوسری رائے ہو تو انقلابی عمل کے ذریعے اس نظام کو بدلنا ضروری ہوگا۔ انقلابی عمل کے ذریعہ کسی نظام کو تبدیل کرنے کو میں "انقلابی سیاست" کا نام دیتا ہوں۔ میں نے "تنظیم اسلامی" کے نام سے جو تنظیم قائم کی ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے۔ میں نے یہ فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ انتخابی سیاست سے تو ہم بالکل کنارہ کش ہیں اور رہیں گے۔ البتہ نظری سیاست کے سلسلے میں اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے اور میرا مقصد یہ ہے کہ انقلابی جماعت کے ذریعہ ملکی نظام میں تبدیلی لائی جائے۔

جنہیں ہم علمائے دین کہتے ہیں انکی اکثریت محض ایک مذہبی پیشے سے متعلق ہے

سوال: سیاست اور نظامِ حکومت کی بات چل نکلی ہے تو میں اس سلسلے میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ عام تاثر یہ ہے کہ علماء نے ہمیشہ سیاست میں زور شور سے حصہ تو لیا لیکن سیاسی شعور سے بہرہ ور ہونے کا ثبوت نہیں فراہم کیا؟ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب : برصغیر کے حالات کو اگر بالخصوص زیرِ بحث لانا چاہیں تو اس کے پس منظر کی طرف جانا پڑے گا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے آخری ایام میں مسلمانوں کا من حیث القوم اسلام سے تعلق بہت کمزور ہو چکا تھا اور اسلام نے صرف رُسوم کی شکل اختیار کر لی تھی۔ تب ہی تو یہ ہوا کہ ہم نوالۂ تر ثابت ہوئے اور مغربی امپیریلزم نے ہمیں ہڑپ کر لیا۔ دیکھا جائے تو یہ سارا مسئلہ اس وقت شروع ہوا جب انگریزی راج یہاں مستحکم ہو گیا۔ اُس وقت کے حالات میں وقتی طور پر یوں محسوس ہوا کہ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی اور ہم محکوم و مغلوب ہو کر رہ گئے چنانچہ اَب سیاست کے ساتھ کیسے عہدہ برا ہوا جائے! خصوصاً علمائے دیوبند نے اس مسئلے کو سب سے پہلے محسوس کیا اور یہ حکمتِ عملی ان کے حقیقت پسندانہ شعور کا ثبوت ہے کہ انگریز کے ساتھ کھلے میدان میں مقابلہ کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اس لیے کونوں کھُدروں میں گھُس کر اپنے دین، کلچر اور ثقافتی روایات کا تحفظ کیا جائے۔ اس پر فراریت کی پھبتی بھی کَسی جا سکتی ہے لیکن علماء کے نزدیک اُس وقت کے حالات میں یہ حکمتِ عملی درست تھی۔

اس کے برعکس علی گڑھ تحریک کے حامیوں اور سر سید احمد خاں کے ساتھیوں نے ایک دوسری پالیسی اختیار کی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت نے ان ہی کی پالیسی کو اختیار کیا۔ یہ ہے وہ مقام جہاں سے برصغیر کی سیاست سے علماء کا عملی تعلق منقطع ہونا شروع ہوا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی سیاست کے میدان میں ہمیں زبردست شخصیتیں نظر آتی ہیں جنہوں نے جرأت، ہمت اور سیاسی شعور کا ثبوت دیا۔ میری مراد حضرت شیخ الہند سے ہے۔ لیکن اپنوں کی غداری کی وجہ سے وہ بھی ناکام ہوئے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے بعد برصغیر میں علمائے دین اکثر و بیشتر دوسری عظیم تر سیاسی تحریکوں کے ضمیمے کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ مثلاً کانگریس کے ساتھ جمعیت العلمائے ہند اور مسلم لیگ کے ساتھ جمعیت العلمائے اسلام۔ یا بریلوی مکتبۂ فکر کے علماء اور مشائخ۔ اس میں ایک نام ذرا مختلف ہے اور اسے میں براہِ راست "اسلامی احیائی تحریک" کا نام دیتا ہوں۔ اس کے نقیبِ اوّل مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم تھے، جنہوں نے ۱۹۱۲ء میں روزنامہ الہلال اور البلاغ کی ولولہ انگیز

جماعتِ اسلامی عملی سیاست میں کُودنے کے باوجود اس کے تقاضوں کو پورا نہ کرسکی

دعوت کے ذریعے مسلمانوں کو احیائے اسلام کے لیے دین کی دو عظیم ترین حقیقتوں "قرآن اور جہاد کی طرف متوجہ کیا۔ حضرت شیخ الہند نے ان کے جوہرِ قابل کو پہچان کر ۱۹۲۰ء میں جبکہ ان کی زندگی کا چراغ گُل ہوا چاہتا تھا یہ کوشش کی کہ علماء من حیث الجماعت مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت کو قبول کر لیں اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے انہیں امام الہند مان کر آزادیٔ وطن اور احیائے اسلام دونوں کی تحریک بیک وقت شروع کریں۔ مگر بعض علماء کی مخالفت کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اس سے بددل ہو کر مولانا آزاد نے اپنا راستہ ہی تبدیل کر لیا اور اپنی بقیہ زندگی پورے ثبات و استقلال کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست میں گزار دی۔

پھر قریباً ۱۲، ۱۴ سال بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے اس دَور کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مقابلے میں زیادہ محنت و مشقت اور زیادہ ثبات و استقلال کا ثبوت دیتے ہوئے تحریکِ جماعتِ اسلامی کا آغاز فرمایا۔ انہوں نے مسلمانوں کی قومی سیاست سے ہٹ کر ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت قائم کی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی مانند اپنے اصولی موقف پر صرف سات آٹھ سال ہی قائم رہ سکے اور قیامِ پاکستان کے بعد جماعتِ اسلامی کا بجز و اعظم یہاں کی قومی سیاست میں اُلجھ کر رہ گیا۔ اس وقت پاکستان میں جماعتِ اسلامی اور علماء کے جو حلقے سیاسی میدان میں فعال نظر آتے ہیں ان کے بارے میں یہ صحیح تجزیہ ہے کہ جماعتِ اسلامی عملی سیاست میں کودنے کے باوجود اس کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکی۔ علماء کے سامنے بھی کوئی خاص مطمحِ نظر محسوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ دوسری سیاسی تحریکوں کے ضمیموں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اور ان کا مقصدِ اوّلین بھی حصولِ اقتدار ہی رہ گیا ہے۔

سوال : کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ علمائے دین سیاست کی کوچہ گردی کرنے کی بجائے لوگوں کی اخلاقی اصلاح کی طرف توجہ دیتے؟

جواب : اصل میں اخلاق کا تعلق انسان کے نظریات سے ہے۔ ہمیشہ اخلاق کو کسی نظریاتی اَساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے لیے نظریاتی اَساس ایمان ہے۔ بدقسمتی سے مغربی خیالات کے تسلّط کی وجہ سے ہمارے ایمان کی جڑیں بہت کمزور ہو چکی ہیں اور ہم مجموعی طور پر ایک خلاء میں ہیں۔ وطن پرستانہ اور قوم پرستانہ اخلاق ہمارے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا۔

ایمان و اخلاق کے لیے جو اساس یعنی ایمان درکار ہے وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اسی طریقے سے جنہیں ہم علمائے دین کہتے ہیں ان کی اکثریت محض ایک مذہبی پیشے سے متعلق ہے۔ نہ علم کی گہرائی حاصل ہے نہ یقین و ایمان کی وہ کیفیت جس سے ان کے کردار کی تخلیق ہو اور وہ دوسروں کے اخلاق تخلیق کر سکیں۔

جنہیں ہم علما کہتے ہیں یہ ایک مذہبی سول سروس ہے جو بدقسمتی سے آرگنائزڈ بھی نہیں ہے

یوں سمجھئے کہ یہ ہمارے ہاں ایک مذہبی سول سروس ہے جو بدقسمتی سے آرگنائزڈ بھی نہیں ہے۔ کوئی معیار، کوئی درجہ بندی نہیں ہے۔ بمقابلہ ایرانی علماء کے کہ ان کے ہاں علماء کا پورا نظام بہت منظم اور مربوط ہے۔ ان میں قوتِ عمل اور یکجہتی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اینٹی بھٹو تحریک اور ایران کی اینٹی شاہ تحریک اگرچہ بہت سے اعتبارات سے مماثل تھیں مگر ہمارے ہاں اس کا نتیجہ ایک نئے مارشل لا کی شکل میں سامنے آیا جبکہ ایران میں کم از کم ایک مذہبی حکومت (تھیاکریسی) قائم ہوئی۔ اس پس منظر میں اصل حل وہی ہے کہ ایک زبردست انقلابی تحریک برپا ہو جو سب سے پہلے مسلمانوں کے قلوب و اذہان کو اسلام کے حق میں مسخر کرے۔ اس کے نتیجے میں خالص ایمانی اور اسلامی اخلاق اور سیرت و کردار وجود میں آئے گا اور پھر ایسے لوگوں کی اجتماعی جدوجہد سے انقلاب برپا ہو گا۔

سوال۔ لیکن یہ کام کون کرے گا؟

جواب۔ یہ کام وہ ہے جس کی نشان دہی مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی اور اس جہت میں کچھ پیش قدمی مولانا مودودی نے کر کے دکھائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ امت کا مستقبل اس کام سے وابستہ ہے اس لیے میں اپنی حقیر سی مساعی کو اسی رُخ پر صرف کروں گا۔

سوال۔ علماء کرام پر ملت کی طرف سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں کیا وہ اُن سے عہدہ برآ ہوئے ہیں؟

جواب۔ یہ کہنا آسان ہے کہ علماء کو یہ کرنا چاہیے وہ کرنا چاہیے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان علماء کی تعلیم کا نظام کون سا ہے۔ معاشرے نے انہیں کیا سٹیٹس دیا ہے؟ کوئی کھاتا پیتا آدمی اپنے بچے کو علم دین کی طرف بھیجنے کو آمادہ نہیں ہے۔ یہ ہمارے قومی زیاں اور اضمحلال کا ایک مظہر ہے۔ لہٰذا علماء کو DISOWN کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ ان کی جانب سے ہمیں یہی غنیمت سمجھنا چاہیے کہ وہ اسلامی شعائر کا ایک ڈھانچہ تو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک بے روح ڈھانچہ ہے۔ مسجدیں ہیں جہاں نمازیں ہوتی ہیں۔ خطبے ہوتے ہیں۔ ختنے ہوتے ہیں۔ جنازہ اور نکاح کی سروس موجود ہے۔ حلال و حرام کے مسائل بتانے کے لیے لوگ موجود ہیں۔ ہمارے علماء کیونکہ بحیثیت مجموعی آج سے سالہا سال پہلے کی ذہنی اور فکری فضا میں رہ رہے ہیں اس لیے ان سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کرنا زیادتی ہے۔

جب عوام کو جان دینے پر آمادہ کرنا ہو تو تحریک میں نام اسلام کا ڈال دیا جاتا ہے

سوال۔ لیکن ہمارے علماء کی بدنظمی، اضمحلال اور بے عملی کا سبب کیا ہے؟ جب کہ آپ نے ابھی ایرانی علماء کی مثال بھی پیش کی ہے۔

جواب۔ آپ یہ نہ بھولیے کہ ہم براہِ راست انگریز کے غلام ہوئے۔ ایران کبھی غلام نہیں ہوا۔ لہٰذا ان کا مذہبی علماء کا نظام بھی محفوظ (INTACT) رہا۔ جبکہ ہمارے ہاں وہ انتشار کا شکار ہو گیا۔ جو بھی شخص ایک کمرے میں مکتبہ بنا کر بچوں کو پڑھاتا ہے وہ بورڈ جامعہ کا لگا دیتا ہے۔ یہ ایک خود رَو اور جنگلی افزائش ہے۔

سوال۔ بھٹو حکومت کے خلاف تحریک کے دوران علماء نظامِ مصطفیٰ کا نعرہ بلند کیا۔ اس نعرے کی خاطر لوگوں نے سینوں پر گولیاں کھائیں، جان و مال کی قربانیاں پیش کیں لیکن جیسے ہی بھٹو حکومت کا خاتمہ ہوا ہمارے علماء نظامِ مصطفیٰ کو بھول گئے اور اس سمت میں کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ بلکہ اس کے برعکس ایسی طاقتوں کے ساتھ علماء نے اشتراک کر لیا جو اس کی قائل ہی نہیں ہیں اور ملکی مسائل کا حل سوشلزم میں تلاش کرتی ہیں نظامِ مصطفیٰ کی تحریک کا یہ حشر کیوں ہوا؟

جواب۔ دیکھیے۔ اصلاً بھٹو مخالف تحریک نہ علما نے اُٹھائی اور نہ ہی یہ علماء کی تحریک تھی۔ یہ تو ایک خالص سیاسی تحریک تھی جو ایک حکمرانِ وقت کے خلاف ہمہ جہتی ردِّعمل کی صورت میں شروع ہوئی اس میں ہمارے ملک کے جملہ سیاسی عناصر شامل تھے۔ دائیں بازو والے بھی اور بائیں بازو والے بھی۔ سیکولر بھی اور مذہبی بھی۔ اور مذہبی میں لبرل بھی اور آرتھوڈکس (قدامت پسند) بھی چنانچہ اس تحریک کا نام بھی 'پاکستان قومی اتحاد' تھا۔ اس کے نام میں بھی اسلام کا لفظ شامل نہ تھا۔ بعینہٖ یہی معاملہ ایران میں تھا۔ شاہ ایران کے خلاف تحریک میں تودہ پارٹی بھی شریک تھی اور دوسری غیر مذہبی جماعتیں بھی علماء کے شانہ بشانہ برسرِ پیکار تھیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی مسلمان ملک میں کوئی تحریک جب اس مرحلے پر آتی ہے کہ عوام کو جان دینے پر آمادہ کیا جائے تو ع بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر میں علمائے دین اکثر و بیشتر عظیم تر سیاسی تحریکوں کے ضمیمے کی حیثیت سے کام کرتے رہے

اس لیے نام اسلام کا ڈال دیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہ نظامِ اسلامی کی تحریک بن گئی اور ایران میں بھی تحریک نے اسلامی انقلابی تحریک کا رُخ اختیار کر لیا۔ چنانچہ اس کی علامت کے طور پر پاکستان میں اس تحریک کی قیادت بھی مفتی محمود مرحوم کے سپرد کر دی گئی۔ ایران میں اس کی قیادت امام خمینی کے ہاتھ میں آئی لیکن یہاں سے آگے فرق ہے۔ مفتی مرحوم کی قیادت صرف علامتی قیادت تھی اس لیے کہ یہاں دینی عناصر کی کوئی تنظیم موجود نہ تھی بلکہ چار پانچ جماعتیں تھیں۔ جو صرف ایک وقتی ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے تعاون کر رہی تھیں۔ لہٰذا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہاں نتیجہ نکلا مارشل لاء کی صورت میں جبکہ ایران میں علماء کی تنظیم بہت مضبوط تھی اور خمینی صاحب کی قیادت بھی حقیقی اور واقعی قیادت تھی۔ اس لیے وہاں فوری طور پر ایک مذہبی حکومت قائم ہو گئی۔

سوال۔ یہاں میں یہ دریافت کروں گا کہ ہمارے عوام نے جان بوجھ کر دھوکہ کھایا یا انہیں عمداً دھوکہ دیا گیا؟

جواب۔ دراصل یہ فیصلے کی خامی تھی۔ ہمارے علماء اس مغالطے میں تھے کہ عوام بعد میں بھی ہمارا ساتھ دیں گے وہ صحیح سچویشن کو نہ سمجھ سکے اور آپس کی نااتفاقی کی وجہ سے نقصان اُٹھایا۔

ابھی ڈاکٹر اسرار کا فقرہ ختم ہی ہوا تھا کہ قرآن اکیڈمی کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ہماری گفتگو کو کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا ہے۔ ڈاکٹر اسرار نمازِ باجماعت کی امامت بذاتِ خود کرتے ہیں۔ یوں بھی جن حالات میں وہ میری ساتھ گفتگو کے لیے آمادہ ہوئے تھے اس کے بعد ان کو مزید مصروف رکھنا سراسر بداخلاقی ہوتی۔ اس لیے میں نے ان سے اجازت چاہی اور انہوں نے اپنی عدیم الوقتی کے باوجود اگلے روز نمازِ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت مقرر کیا۔

اگلے روز میں نمازِ عصر کے وقت پہنچا۔ جماعت کھڑی ہونے والی تھی۔ ڈاکٹر اسرار امامت کے لیے کھڑے تھے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ عقبی دروازے سے دفتر کی طرف چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد میں ان کے پُرسکون اور پُرعافیت دفتر میں موجود تھا۔ آج میرے ساتھ ایک فوٹو گرافر صاحب بھی تھے۔

ہمارے لوگ رہنمائی کے لیے علماء کی طرف بالکل نہیں دیکھتے

ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور بولے: "بھئی کل تو آپ بہت شرعیانہ طریقے پر آئے تھے لیکن آج کیا معاملہ ہے؟"

عرض کیا: "اعتراض نہ ہو تو آپ کی چند تصاویر اتار لی جائیں۔ اس کے بعد فوٹو گرافر صاحب رخصت ہو جائیں گے اور ہم اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔"

وہ بولے "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

میں نے کہا: "اجازت طلب کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بعض علماء تصویر کشی کو جائز نہیں سمجھتے۔ ۱۹۵۶ء میں جب میں نے مولانا مودودی مرحوم سے تصویر کشی کے بارے میں معلوم کیا تھا تو انہوں نے فرمایا تھا: 'میں اسے جائز نہیں سمجھتا' لیکن چند سال بعد مولانا کی تصاویر اکثر اخبار و رسائل کے صفحات پر نظر آئیں۔ اس کا جواز وہ یہ پیش کرتے تھے کہ اگر کوئی اجازت

کے بغیر میری تصویر اُتار لے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" ڈاکٹر صاحب بولے "مولانا کی بعض تصاویر خود ان کے دفتر میں بھی اُتاری گئی ہیں۔ اگر ایسا تھا تو مولانا فوٹو گرافر کو منع فرما سکتے تھے۔" اس اثنا میں فوٹو گرافر صاحب تصاویر اُتار کر رخصت ہو گئے۔

میں نے پہلا سوال کیا۔ ڈاکٹر صاحب! یہ کیا بات ہے کہ ہمارے اکثر علمائے کرام پہلے ایک چیز کو رَد کر دیتے ہیں لیکن بعد میں اسی چیز کو آہستہ آہستہ اپنا لیتے ہیں۔ عوام الناس کے ذہنوں میں اس طرح اُلجھن اور ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔

جواب۔ صحیح فرمایا آپ نے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

سوال۔ یہ فرمایئے کہ ہمارے کئی علمائے کرام نے سیاست میں حصّہ لیا لیکن کوئی نمایاں کارکردگی نہ دکھا سکے جب کہ ان سیاسی مصروفیات کی بنا پر وہ اپنے مذہبی فرائض کی طرف کما حقہٗ توجہ نہ دے سکے۔ مثال کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، علامہ مشرقی۔ اگر یہ حضرات خود کو مذہبی اُمور کے لیے وقف رکھتے تو زیادہ بہتر نہ ہوتا؟

جواب۔ علامہ مشرقی کو میں علماء میں شمار نہیں کرتا، رہا دوسرے علماء کا سیاست میں حصّہ لینے کا مسئلہ تو بعض علماء نے بلند اور نیک مقاصد کے پیشِ نظر سیاست کی طرف توجہ دی۔ انہوں نے اپنی بساط کے مطابق سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لیا۔ بعد میں ان سے غلطی ہوئی یا حالات ہی کچھ ناسازگار تھے اس لیے وہ اس میدان میں کارہائے نمایاں نہ دکھا سکے۔ جنہوں نے سیاست

جو شخص بھی مکتبہ بنا کر بیٹھتا ہے وہ بورڈ جامعہ کا لگا دیتا ہے

میں حصّہ لیا میرے نزدیک علماء میں ان کا تناسب بہت کم ہے۔ ہمارے ہاں اب بھی ایسے علماء ہیں جو سیاست میں حصّہ نہیں لیتے۔ جو اپنی مساجد اور خانقاہوں میں بیٹھے ہیں۔ جن کا کام دین کی تبلیغ اور اخلاق و تقویٰ پیدا کرنا ہے۔ یا وہ علماء ہیں جن پر زیادہ چھاپ تصوّف کی ہے سیاست کی ان پر چھاپ نہیں ہے۔ وہ اپنے اپنے میدان میں بیٹھے کام کر رہے ہیں اور یہ کہ بہت بڑا دیوبندی اور تھانوی حلقہ ہے وہ اسی کام کے اندر مگن ہے۔ بعض علماء نے خود کو صرف تدریس کے اندر گم کر دیا ہے جیسے مولانا یوسف بنوری نے۔ اگر یہ ختمِ نبوّت کی تحریک میں ۱۹۷۴ء (جو سیاسی تحریک نہیں تھی) میدان میں نہ آتے تو شاید پاکستان میں اُن کو لوگ عام طور پر نہ جانتے۔ اپنی پوری زندگی اُنہوں نے اپنے آپ کو اسلامی دارالعلوم بنوری ٹاؤن کی خاطر وقف کر دیا۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہاں علماء کی مختلف پہلوؤں سے خدمات ہیں۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد جن لوگوں نے سیاست میں حصّہ لیا اُن کے بارے میں آپ بہت سی باتیں کہہ سکتے ہیں کہ اُن کا کوئی مؤثر رول بھی نہیں ہو سکا۔ میرے خیال میں وہ دوسری تحریکوں کے لیے ضمیمہ بن کر چلتے رہے۔ اب اُن کی صفوں میں کوئی ایسی شخصیت بھی نظر نہیں آ رہی جو انہیں یکجا کر کے ایک بہت بڑی طاقت بنا دے۔ اسی طریقے سے مکاتیبِ فکر ہیں جن میں تقسیم در تقسیم کا عمل جاری ہے۔ مثلاً جمعیت علمائے اسلام یہ دیوبندی علماء کا سیاسی گروپ رہا ہے۔ دیوبندی علماء میں ایک تھانوی گروپ جنہوں نے کبھی سیاست میں براہِ راست حصّہ نہیں لیا۔ جیسے درس و تدریس میں دلچسپی رکھنے والے علماء جنہوں نے کبھی سیاست میں حصّہ نہیں لیا جیسے مولانا بنوری انہوں نے کبھی سیاست میں حصّہ نہیں لیا۔ اب جو بھی سیاسی طور پر دیوبندیوں کا سرگرم حلقہ تھا اسی گروپ کا ایک حصّہ صدر ضیاء الحق سے اچھی اُمیدیں وابستہ کر کے ان کے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔ ایک گروپ اُس کے برعکس ایم آر ڈی میں ہے۔ اور ایک گروپ وہ ہے جو نہ اِدھر کا ہے اور نہ اُدھر کا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ حالات کی جو گمبھیرتا ہے اُس کو اگر ہم پسِ منظر میں نہ رکھیں تو پھر علماء کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ پھر ہمارے مسائل کی جو پیچیدگیاں ہیں اور اس قسم کا جو رول ہے اُس کے اندر سے مثبت پہلو کو تلاش کیا جائے۔ میری اپنی سوچ کا جو انداز ہے وہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ یہ تنقید کروں کہ فلاں نے یہ نہیں کیا فلاں نے یہ نہیں کیا، میں کوشش کرتا ہوں کہ میں یہ سوچوں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟

تحریکِ نظامِ مصطفےٰ میں علماء کی قیادت صرف علامتی تھی

سوال۔ ڈاکٹر صاحب لوگوں کے کردار اور عمل کو بہتر بنانے اور اُن کی رہنمائی کرنے کی ذمّہ داری کس پر ہے؟ کیا علمائے کرام پر اس کی ذمّہ داری عائد نہیں ہوتی؟

جواب۔ یہ تو ہر باشعور مسلمان کا فرض ہے۔ آپ اس کو صرف علماء کے ذمّے کیوں ڈالتے ہیں؟

سوال۔ اس لیے کہ باشعور مسلمان اپنی رہنمائی کے لیے زیادہ تر علمائے کرام سے رجوع کرتے ہیں۔

جواب۔ علماء کی طرف رہنمائی کے لیے ہمارے لوگ بالکل نہیں دیکھتے اگر علماء کی طرف وہ دیکھتے ہیں تو صرف مسائل جاننے کے لیے اصل صورت یہ ہے کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق اور کردار رفتہ رفتہ بہت نیچے گر گیا ہے۔ یہ عمل کوئی چھوٹا موٹا نہیں ہے یہ صدیوں سے چلتا آرہا ہے۔ جیسے حفیظ کا ایک شعر ہے ؏

؏ تشکیل و تعمیرِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصّہ ہے　　نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

تو ہمارا تو یہ نصف صدی کا نہیں ہے بلکہ اس صدی کا (PROCESS) ہے جس میں قوم گرتی جارہی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ جن لوگوں کو کچھ شعور حاصل ہوتا ہے اور وہ اس کی بہتری کے لیے سوچتے ہیں۔ اس میں اب دو قسم کے نقطۂ نظر تو خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہمارے زوال کا اصل سبب کیا ہے؟ اُس کی وجہ تلاش کریں پھر اُس کی جو تعمیرِ نو ہے جڑ بنیاد سے شروع کریں۔ اس حد تک جہاں ہم پہنچ چکے ہیں کم از کم اُس کا سدّباب کیا جائے۔ کچھ مسلمانوں کی سیاسی بہتری اُن کے مسائل اور مشکلات کا حل کیا جائے۔ میرے نزدیک قومی تحریکیں یا علماء کا رول اس پہلو سے اہم ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی دینی اور مذہبی رہنمائی کی ہے۔ تو یہ کام سیاسی تحریکوں اور علماء نے کیا ہے۔ علماء کا ایک بہت اہم رول یہ رہا ہے کہ اس دَور میں اسلام پر جو فتنے حملہ آور ہوئے ہیں خواہ وہ عقیدے کے راستے آئے ہیں یا نئے نظریات کے ذریعے انھوں نے کم از کم اُن کا مقابلہ کر کے اسلام کو محفوظ کیا۔ اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ ہم گرے کیوں؟ ہمارے اخلاق کا جنازہ کیوں نکلا؟ ہمارا یقین اور اعتماد کیوں ختم ہوا؟ اب اس یقین کی دوبارہ تعمیرِ نو کرنا میرے نزدیک اصل کام ہے۔ یہ وہ اچھا کام ہے جس کے لیے ہمیں بہت منظّم ہونا پڑے گا اور اس میں ہمیں اپنے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنتِ مبارک کو سامنے رکھنا ہوگا کہ حضورؐ نے جو کچھ کیا اُس میں سب سے پہلے کس بات کو اہمیت دی گئی اور بعد میں کیا کام کیا؟ سیرت النبی کو سامنے رکھ کر یہ کام ہوگا۔ اس نوعیت کا کام جسے میں احیائے دین کہتا ہوں۔ باقی یہ کہ جو حالات پوچھے گئے ہماری سیاسی تحریکیں ہوں یا ہمارے علماء کا طبقہ انھوں نے اس حالت میں جو کچھ بہتر طور پر کر سکتے تھے کیا۔

انتخابی سیاست سے تو ہم بالکل کنارہ کش ہیں البتہ نظری سیاست کے سلسلے میں جدّ و جہد جاری رکھیں گے

سوال۔ تبلیغی جماعتوں اور تحریکوں کی کارکردگی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ اصل میں تھوڑی سی آپ کی تصحیح اس طرح کروں گا کہ تبلیغی جماعتیں یا تحریکیں یہ اصطلاح غالباً کچھ صحیح نہیں۔ اس وقت صحیح معنوں میں تبلیغی جماعت ایک ہے جو بڑے پیمانے پر کام کرتی ہے۔ ویسے تو یہ کہ ہمارے ہاں جو بھی مکتبۂ فکر ہے مذہبی مکتبۂ فکر، وہ ایک تبلیغی حلقہ رکھتا ہے اپنے خیالات پھیلاتا ہے کوئی جلسہ کرتا ہے تو اس کے لیے عظیم الشان کانفرنس ہوتی ہے اور بڑے بڑے پوسٹر چھپتے ہیں حالانکہ اُس میں سوائے فرقہ وارانہ مسائل کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ محض اختلافی مسائل ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کا عظیم تحریک کی حیثیت سے آغاز کیا تھا مولانا الیاس رحمۃ اللہ نے۔ اس تحریک کا مفید پہلو کیا رہا؟ اُسے بھی ہمیں اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اس تحریک کو کام کرتے ہوئے کم از کم پچاس سال ہو گئے ہیں۔ اصل میں یہ تحریک شروع ہوئی تھی ہندوؤں کی شُدھی تحریک کے جواب میں۔ اس لیے کہ جب شُدھی تحریک چلی تو دہلی کے آس پاس کا جو قبائلی علاقہ تھا اس کا حال یہ تھا کہ کبھی کوئی ایمان لے آیا کسی روحانی شخصیت کے زیرِ اثر مگر باقاعدہ طور پر اُن کی تعلیم و تربیت کا کوئی اہتمام نہیں ہوا۔ کلمہ کبھی نہیں پڑھا۔ لہٰذا جواب میں مسلمانوں نے بھی تبلیغی کوششیں کیں مگر ان میں سے کوئی بھی کوشش بارآور ثابت نہ ہو سکی۔ پھر مولانا الیاس رحمۃ اللہ کی جو تحریک ہے انھوں نے لوگوں کو موبلائز کیا کہ وہ اپنا کھائیں اپنا پئیں اور وہ گروپس کی شکل میں جائیں اور جو اُن کے بنیادی فرائض ہیں اُن کی طرف مسلمانوں کو راغب کریں۔ انھیں کلمہ سکھائیں۔ اُن مسجدوں میں جھاڑو دیں جو بند پڑی ہیں۔ لوگوں کی خوشامد کر کے مساجد میں لائیں۔ انھیں وضو کرنا سکھائیں، انھیں نماز پڑھنی سکھائیں۔ یہ جو کام تھا سب اہم تھا۔ انھوں نے یہ رویّہ رکھا تھا کہ نہ کسی سے کچھ کھانا پینا نہ اُن سے کوئی شے لینا، نہ اُن سے کوئی خدمت لینا بلکہ اپنے خرچ پر جانا اور اپنے ساتھ کھانے کے لیے چاہے بھُنے ہوئے چنے لے گئے۔ مسجدوں میں جھاڑو دے رہے ہیں گندے اور میلے کچیلے لوگوں کی منت سماجت کر کے انھیں مساجد میں لا رہے ہیں یہ کام جو تھا اُس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے اور یہیں سے تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک

نے بعد میں بڑھ کر عالمی شکل اختیار کرلی لیکن مجھے یہاں اختلاف یہ ہے کہ انہوں نے اسی میتھوڈولوجی کو یونیورسلائز کرلیا ہے۔ اسی طرح وہ امریکہ میں بھی جاکر جو کام کرتے تھے اُس میں ہمارے ہاں ایک تقدس کا پہلو شامل ہوتا تھا۔ اور یہ وہی مشن تھا جس کا آغاز

سوال یہ ہے کہ معاشرے نے علما کو کیا حیثیت دی ہے؟ کوئی کھاتا پیتا آدمی اپنے بچے کو علمِ دین کی طرف بھیجنے کو آمادہ نہیں ہے۔

مولانا الیاس شمس اللہ نے کیا تھا۔ بلاشبہ انھوں نے اِس سلسلے میں بہت ٹھوس کام کیا لیکن ہمارے ہاں اُس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے کثیر تعداد میں نوجوان پروفیسر اور ملازمت پیشہ لوگ اس کی لپیٹ میں آگئے ہیں اور انہوں نے کم ازکم مذہبی اعتبار سے دوسروں کو دیکھ کر ہی نماز پڑھنا شروع کردی۔ مسجدوں میں جانے لگے دینی مسائل اور فضائل میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ سو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سارے کام یقیناً قابلِ ستائش ہیں۔ لیکن اس سے آگے جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ سیرت وکردار کی تعلیم دینا۔ نہی عن المنکر کی بدیوں سے روکنے کے کام کو نظرانداز کردیا گیا۔ اسی طرح انہوں نے قرآن مجید کو اپنے مرکزی ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کیا ہے۔ بلکہ وہ تقاریر سے ہی سارا کام کر رہے ہیں اور تیسری کمی مجھے جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے آگے کا کوئی نقشہ وہ لوگوں کو نہیں دے رہے کہ اسلام کو دنیا پر غالب لانے اور اُسے پھیلانے کا کیا طریقہ اور لائحہ عمل ہونا چاہیے؟ وہ ہدف سامنے محسوس نہیں ہو رہا جیسے میں اکثر مثال دیا کرتا ہوں کہ بیل جو ہوتی ہے وہ زمین پر پھیلتی ہے مگر درخت اُوپر کی طرف اٹھتا ہے میرے نزدیک انقلابی تبلیغ کی ایک اعلیٰ مثال کیمونسٹ تبلیغ ہے کہ وہ جس طرح لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتے ہیں اپنے مذہب اور نظریات کا جس انداز سے پرچار کرتے ہیں وہ انتہائی مؤثر ہوتا ہے لیکن اُن کی ساری کوشش کا ہدف ہے "کمیونسٹ انقلاب" کہ وہ ان لوگوں کو ہم خیال بناکر معاشرے کے اندر اپنے نظریہ کے مطابق ایک انقلاب بپا کریں۔ اسی طرح خالص مذہبی تحریک کی ایک اور واضح مثال عیسائیت کی تبلیغ ہے اس میں کوئی نظام نہیں، عجیب مذہب ہے جس میں کوئی شریعت نہیں محض ایک عقیدہ ہے جسے

دُنیا میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں لیکن اسلامی حکومتیں بہت قائم نہیں ہوئیں

پھیلاتے چلے جاتے ہیں۔ تو یہ مذہبی تبلیغ ہے جس کی مثال کرسچین مشنری جدوجہد ہے۔

جبکہ اسلام میں درحقیقت دونوں عناصر موجود ہیں یعنی عقیدہ بھی پھیلایا' توحید اور آخرت کی تعلیم دی اور نبوت' رسالت' عقیدۂ قرآن اور ختمِ نبوت پر ایمان پختہ کرایا۔ اور پھر یہ ہے کہ جو لوگ اس تحریک کو قبول کریں وہ اس کو منظم کرکے دینِ حق کا نظام عدلِ اجتماعی قائم کرنے کی انقلابی جدوجہد کریں۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے ۲۳ برس میں یہ دونوں چیزیں بہت نمایاں نظر آتی ہیں کہ آپ نے اسلام کو بھی پھیلایا اور ایک انقلابی تحریک بھی چلائی۔ تو یہ دوسرا عنصر ہماری تبلیغی جماعت میں نہیں ہے۔ جہاں تک کردار کا تعلق ہے تو یہ کسی نہ کسی طرح زندگی کے نصب العین کے حوالے سے بنتا ہے۔ اگر ایک انسان کا اپنی ذات کو اُبھارنا ہی نصب العین بن جاتا ہے تو یہ بھی درست ہے۔ کیونکہ اس میں انسان کے اندر محنت کا جذبہ بڑھے گا۔ وہ مشقت کرے گا کیونکہ وہ آگے بڑھنا چاہے گا۔ کسی کا یہ نصب العین بن جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک و قوم کا نام بلند کرنا چاہتا ہے اُس کے لیے اُس میں ایثار پیدا ہوگا۔ وہ قومی مفادات کو سب سے مقدم سمجھے گا تو ایک قوم پرستانہ اخلاق وجود میں آجائے گا اسی طرح اسلام کا جو اخلاق ہے وہ وجود میں ہی تب آتا ہے جب کہ انسان اسلام کے غلبے کی جدوجہد ہی کو اپنی زندگی کا نصب العین بناتا ہے کہ اسلام کا بول بالا کرنے کے لیے کام کیا جائے۔ اس جدوجہد میں جب انسان بڑھے گا تو اس کی رُو سے اس میں مومنانہ کردار پیدا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ کردار کے لیے کوئی بنیاد ہونی چاہیے۔ کوئی نہ کوئی آئیڈیل کوئی نہ کوئی نصب العین ہونا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ من حیث القوم مسلمانوں کے نصب العین کے لیے کوئی آئیڈیل اور کوئی بنیاد نہ تھی اس لیے باقی دنیا میں کردار کے جو احساسات ہیں ان کی تو ہم اپنی نظریاتی Commitment کی وجہ سے نفی کرتے ہیں۔ نہ ہم قوم پرستی کو جائز قرار دیتے ہیں اور نہ ہم وطن پرستی کو جائز قرار دیتے ہیں لہٰذا ان ساری پرستشوں کی عقیدۂ شرک کے ساتھ نفی ہو جاتی ہے۔ گویا ہم اخلاقی اعتبار سے خلا میں ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس کوئی بنیاد نہیں ہے۔

سوال۔ یہ کہا جاتا ہے کہ آج تک کسی ملک میں صحیح اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی؟

جواب۔ یہ غلط ہے کہ آج تک قائم نہیں ہوئی۔

سوال۔ آج کے زمانے سے میری مُراد ماڈرن اور جدید معاشرے سے ہے۔

جواب۔ جی بالکل صحیح ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے ایک نظریاتی مملکت کا تصور پیش کیا، جو حضورؐ نے پیش کیا۔ آپ نے ایک انقلابی جدوجہد کی وجہ سے اُسے قائم بھی کر دیا اور ہم جانتے ہیں وہ اپنی تصوراتی یعنی آئیڈیل شکل میں صرف تیس برس تک قائم رہی۔ اُس کے بعد مسلمانوں کی حکومتیں تو قائم ہوئی ہیں لیکن آئیڈیل قسم کی اسلامی حکومتیں کہیں قائم نہیں ہوئیں۔

سوال۔ آپ کے خیال میں مغربی جمہوریت جس میں عوام کی شرکت ہو اسلام میں کہاں تک جائز ہے؟

جواب۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اپنے کینوس کو وسیع کریں تو یہ رویہ تیسری دنیا سے متعلق ہے۔ اُس میں مسلمان بھی شامل اور غیر مسلم اقوام کی اکثریت بھی شامل ہے۔ یہ دبائی کیفیت ہے جو پوری تیسری دنیا میں موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت یہ تہذیبوں کا ٹکراؤ تھا۔ کیونکہ جب مسلمان دنیا کو اپنے کلچر اور مذہب کے اعتبار سے تسخیر کر رہے تھے۔ اُس وقت یورپ ظلم و تاریکی

بقیہ علماء کے سامنے بھی کوئی خاص مطمعِ نظر محسوس نہیں ہوتا اور اُن کا مقصدِ اولین بھی حصولِ اقتدار رہ گیا ہے

اور بربریت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کے بعد مسلمانوں نے انہیں جگایا۔ قرطبہ اور غرناطہ یونیورسٹیوں سے جو روشنی پھیلی وہ یورپ تک بڑھی۔ اُس کے نتیجے میں دو تحریکیں سامنے آئیں۔ ایک تحریک اصلاح مذہب جو مسلمانوں کے زیر اثر تھی اور دوسری تحریکِ احیائے علوم اور بلاشبہ ان دونوں تحریکوں کے نتیجے میں یورپ میں ایک نئی تہذیب نیا کلچر نئی فکر نئی روشنی پیدا ہوئی علوم سے رغبت اور ایجادات وغیرہ کا عمل شروع ہوا۔ اُس وقت ہم زوال میں جا رہے تھے عیش میں تھے لہٰذا تہذیبوں کے اُتار چڑھاؤ کے حوالے سے اس بات کو آپ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ درحقیقت اسلام سے ان تحریکوں کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اب ایک طرف یورپ نے اپنے عروج میں جو چیزیں حاصل کی ہیں اُن کے پس منظر میں جب عالم اسلام یا پوری تیسری دنیا کا جائزہ لیں گے تو یقیناً مایوسی ہوگی۔ ہم فنونِ علوم اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے اُن سے پیچھے ہیں۔ اس طریقے سے ہمارے اندر جمہوری شعور بھی ابھی پورے طریقے سے نہیں آیا۔ ابھی اس میں تعمیرِ نو کا بہت سا عمل ہونا باقی ہے۔

سوال۔ ڈاکٹر صاحب مسلمانوں میں عالمگیر سطح پر کردار کی پستی اس قدر کیوں ہے؟

جواب۔ اس کا تجزیہ تو میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ ہماری اپنی بنیاد تو ہمارے ہاتھ سے گئی اب دوسری کوئی بنیاد اپنے کردار کی تعمیر کے لیے اختیار کر نہیں سکتے۔ اب تو یہی دیکھنا ہے کہ اُس طرز پر کوئی تحریک اللہ تعالیٰ اس خطے کو کب عطا فرماتا ہے کہ نبی اکرمؐ کے نقشِ قدم پر پھر کسی سطح پر کوئی تحریک اُبھرے جس کی وجہ سے ایمان کی تجدید بھی ہو۔ اور ایک تحریک کی شکل بن کر وہاں انقلاب آئے۔ لیکن درحقیقت یہ شروع سے ہی کرنے کا کام ہے اور انشاء اللہ ایسا ضرور ہوگا۔ میرے نزدیک اس وقت جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں عالم اسلام کے اندر جو بھی عمل ہے اُس کے اندر جو گڈمڈ عناصر ہیں اُس میں ایک یہ تصور بھی بتدریج آگے آ رہا ہے اس کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ ایک دور وہ تھا کہ ہمارے اندر شدید مرعوبیت تھی علامہ اقبال نے اُس پر تنقیدیں کیں۔ پھبتیاں کسیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب اُس قسم کی مرعوبیت نہیں ہے۔ کچھ جوابی تحریکوں نے جیسے جماعتِ اسلامی کی تحریک تھی۔ انہوں نے کہا ہم بھی ہیں۔ ہمارا بھی نظام ہے لیکن ابھی ان چیزوں نے ذہنوں اور دلوں پر کچھ زیادہ اثرات نہیں چھوڑے اور نہ ہی اتنی تعداد میں مسلمان اس سے متاثر ہوئے

اخلاقی اعتبار سے اس وقت ہمارے پاس کوئی بنیاد نہیں ہے

سوال۔ ڈاکٹر صاحب کیا یہ ممکن ہے کہ اسلامی بنیادوں پر پاکستان میں خالص معاشی اور اقتصادی نظام قائم کیا جا سکے؟

جواب۔ یقیناً ممکن ہے لیکن اُس کے لیے ہمیں محنت کرنا پڑے گی کیونکہ ہمارے ہاں ابھی ایسے عناصر ہیں جو صحیح معنوں میں اسلام کا معاشی نظام نہیں لانا چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کے لیبل کے ساتھ اور اسلام کی آڑ لے کر موجودہ سرمایہ دارانہ جاگیردارانہ ڈھانچے کو اسلام کی کاسمیٹکس کے نام پر برقرار رکھا جائے اور اس طرح لوگوں کو بہلایا جائے۔

سوال۔ ڈاکٹر صاحب پچھلے دنوں قومی اخبارات میں ایک تحریک چلی تھی کہ اسلام میں جمہوریت کا کوئی تصور نہیں۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب۔ میرے نزدیک اس دور میں جن لوگوں نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے دراصل وہ مارشل لاء کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں اور انہوں نے کچھ دوسرے طبقات کے خوف سے کہ اگر پیپلز پارٹی یا بائیں بازو کے بعض دوسرے عناصر دوبارہ اقتدار

میں آتے ہیں تو شاید وہ اسلام کا نام ونشان تک مٹا دیں گے ایسا کہنا ہے موجودہ آٹھ سالوں میں جو کچھ ہوا ہے انہوں نے اسے غنیمت سمجھتے ہوئے مارشل لاء حمایت کی ہے اور اب اسی کے تحت انہوں نے یہ فلسفہ ایجاد کیا ہے جو میرے نزدیک بالکل غلط ہے۔ اسلام کا نظامِ ریاست کیا ہے' اسلامی ریاست کا فلسفہ کیا ہے۔ میں اس سلسلے میں بعض اختلافات رکھنے کے باوجود مولانا مودودی کے نظریئے کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ اُنہوں نے اسلامی ریاست کا ایک بالکل صحیح تصور پیش کیا جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اصل جمہوریت سے اسلام اس اعتبار سے مختلف ہے کہ مغربی جمہوریت دراصل حاکمیت کا نام ہے اور اس میں حکمران کو قانون سازی کے لامحدود اختیارات حاصل ہوتے ہیں کہ جو چاہیں طے کر دیں۔ جس چیز کو چاہیں نافذ کریں اور جس قانون کو چاہیں معطل کر دیں۔ اور یہ تو یقیناً اسلام کے اعتبار سے بہت غلط ہے۔ اسلام کبھی اس قسم کی باتوں کی اجازت نہیں دے سکتا۔ البتہ مولانا مودودی نے ایک بہت خوبصورت اصطلاح استعمال کی ہے کہ اسلام میں' پاپولر وائسری جینسی' ہے خلافت ہے لیکن خلافتِ عامّہ ہے۔ یہ خلافت کسی ایک فرد یا کسی ایک خاندان کی جاگیر نہیں ہے بلکہ یہ خلافتِ عامّہ ہے جسے کامن ویلتھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب اس خلافت میں جب' پاپولر وائسری جینسی' آئے گی تو اس میں لوگ اپنے خلیفہ کو منتخب کریں گے۔ یہاں جمہوریت کا عنصر اس کے اندر ہی انٹروڈیوس ہو جاتا ہے مگر میں جب اپنے

زمیندار کون ہے؟ اسلام میں زمین کی ذاتی ملکیت کا کوئی تصور نہیں ہے

نزدیک ایک اسلامی ریاست کا تصور قائم کرتا ہوں تو یہ میرے نزدیک جدید دَور کی اسلامی ریاست اور ہر اعتبار سے جدید ترین اور ترقی یافتہ جمہوریت ہوگی ماسوائے اس کے کہ اُس میں جمہور کا قانون سازی کا حق محدود ہے کہ قرآن وسنّت کے خلاف کوئی قانون وضع نہ کیا جائے۔ یہ بات ہمارے پاکستان کے ہر دستوری خاکے میں ضرور موجود رہی ہے بشرطیکہ اس کو سو فیصدی قابلِ عمل بنا دیا جائے اور سپریم کورٹ کو اس بات کا اختیار مل جائے کہ وہ اس کی بنیاد پر جو بھی رِٹ چاہے سماعت کے منظور کرے اور اس کے بارے میں فیصلہ دے کہ کوئی شخص موجودہ قانون یا کوئی بل جو کہ ابھی پارلیمنٹ میں زیرِ بحث ہے اس کے بارے میں جو چاہے سپریم کورٹ میں جا کر رِٹ دائر کر دے۔ لہٰذا جب آئین میں یہ شق موجود ہوگی جس کے تحت کوئی بھی شخص عدالتِ عالیہ کی کنڈی کھٹکھٹا سکے تو پھر وہاں جا کر علماء کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے دلائل دیں' ثبوت فراہم کریں کہ فلاں قانون یا شق قرآن وسنّت کے منافی ہے۔ باقی ہر اعتبار سے یہ جدید دَور کی ترقی یافتہ ترین جمہوریت ہوگی۔

سوال۔ ڈاکٹر صاحب۔ پاکستان میں یہ جو اسلامی حکومت قائم ہوئی ہے اس کے بارے میں ایک طبقے کا خیال ہے کہ یہ عملی طور پر یہ ممکن نہیں ہے اگر اسلامی نظامِ حکومت قائم ہوگا تو یہ کس نظریئے کے تابع ہوگا۔ اس لیے کہ یہاں تو ہمارے علماء کسی مسئلے پر متفق ہی نہیں ہوتے!

جواب۔ پاکستان میں معاملہ بہت آسان ہے بلکہ جتنا یہ ایران میں آسان ہوا ہے اتنا ہی پاکستان میں بھی آسان ہے ایران میں صورت یہ ہے کہ وہاں اکثریت شیعہ حضرات کی ہے وہ فقہ جعفریہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سُنّی ہیں لیکن وہ اقلیت میں ہیں

امام حنیفہ کے نزدیک مزارعت کی ہر شکل حرام مطلق ہے

لہٰذا انہوں نے فقہ جعفریہ کے تحت اپنا قانون بنا لیا ہے۔ باقی سُنّیوں کو اُن کے پرسنل لاء کے تحت اجازت ہوگی کہ وہ جیسے چاہیں چلیں۔ یہی معاملہ پاکستان میں ہوگا۔ پاکستان میں فرقہ وارانہ اعتبار سے تو بہت زیادہ کشمکش ہے۔ بریلوی اور دیوبندی کے حوالے سے سارے جھگڑے ان ہی میں ہیں۔ لیکن دونوں کا فقہ ایک ہے یعنی دونوں حنفی ہیں۔ جہاں تک قانونِ سنّت کا تعلق ہے تو اُس کے مطابق ان کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس طرح پاکستان میں آبادی کی جو اکثریت ہے وہ حنفی بن جاتی ہے باقی رہ گئے شیعہ تو وہ چند معاملات میں فقہ حنفی سے اختلافات رکھتے ہیں لہٰذا یہاں اگر کوئی مشکل ہوتی ہے تو شیعوں کے ساتھ بھی پاکستان میں وہی معاملہ کیا جائے جو ایران میں سُنّیوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ معقول ہوگا۔ باقی رہ گیا یہاں پر اہلِ سنّت کا معاملہ' تو بہتر صورت میرے نزدیک یہ ہے کہ صرف کتاب وسنّت ہی کو مدِنظر رکھا جائے۔

چونکہ سنّت میں معاملہ یہ ہے کہ فقہ جعفریہ کے سنّت کے ذرائع مختلف ہیں۔ اُن کی احادیث کی کتابیں مختلف ہیں۔ لیکن اہلِ حدیث کی اور حنفیوں کی سُنّت اور حدیث کی جو کتابیں ہیں وہ آپس میں تقریباً متفق ہیں وہ ہیں سے ریفرنس آئے گا وہیں سے حوالہ آئے گا لہٰذا ان دونوں کو یکجا کیا جا سکتا ہے۔

سوال۔ ڈاکٹر صاحب۔ یہاں فقہ جعفریہ کی بہت بڑی تحریک چل رہی ہے اور حکومت نے اُن کے بہت سے مطالبات تسلیم بھی کر لیے ہیں۔

جواب۔ تحریک چلانا اور بات ہے اگر ایک چھوٹی اقلیت اپنی تنظیم کے ذریعے کسی وقت آپ پر دباؤ دے اور اُس وقت کی حکومت پر بھی وہ کسی طریقے سے اثر انداز ہو جائے تو یہ اور بات ہے لیکن ظاہر بات ہے وہ اقلیت ہیں۔ ہم سُنی اور شیعہ کو ایک فقہ میں نہیں لا سکتے۔ کیونکہ سُنیوں اور شیعوں کی قرآن و حدیث کی کتابوں میں بہت فرق ہے۔ قرآن مجید میں بھی کچھ ہمیں شبہ ہے کہ ہمارے شیعہ بھائی اس پر پورا اعتماد کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ لیکن جب مسئلہ آتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اسی قرآن کو مانتے ہیں۔ تو وہاں تک تو بات چل جائے گی۔ لہٰذا اس اعتبار سے جہاں تک جعفریہ فقہ کا تعلق ہے تو اُس کو ہمیں علیحدہ رکھنا پڑے گا۔ باقی رہے مالکی شافعی اور اہلِ حدیث وغیرہ تو اگرچہ یہ ہمارے ہاں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتے مگر ان کو ایک چھتری کے نیچے لایا جا سکتا ہے کہ کسی خاص فرقہ نام استعمال کیے بغیر کتاب و سنت کو استعمال کیا جائے۔ البتہ یہ بھی ہو سکتا ہے یہاں پر۔ چونکہ اہلِ حدیث کی تعداد

شیعوں کے ساتھ پاکستان میں وہی معاملہ کیا جائے جو ایران میں سُنیوں کے ساتھ کیا گیا ہے

کم ہے لہٰذا یہاں پر بنیادی طور پر فقہ حنفی کو ہی اختیار کیا جائے۔ اصل میں جو چیز فیصلہ کُن ہے تو وہ ہے ایک ین بعینہٖ ایک فرد کے مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کی ذات میں ایک تو ارادہ پیدا ہو جائے کہ مجھے مسلمان جینا ہے اور مسلمان مرنا ہے۔ اسی طریقے سے کسی ملک یا کسی خطۂ زمین میں اسلامی نظام کے آنے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں کی آبادی اپنے اندر اسلام کی حمایت میں ایک جذبہ اور تحریک پیدا کرے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ انتخابات کے ذریعے سے ثابت کریں لیکن میرے نزدیک یہ طریقہ درست نہیں ہے کیونکہ انتخابات صرف موجودہ صورتِ حال کو برقرار رکھیں گے۔ جہاں تک نظام کا تعلق ہے انتخاب سے بھی نظام تو نہیں بدلا کرتا جبکہ ہمارا اصل مسئلہ ہی نظام کا ہے۔ انتخابات تو صرف قوانین اور تحریرات کو تبدیل کرتے ہیں لہٰذا دوسرا طریقہ ہے انقلابی عمل کا جس میں ایک عددی اعتبار سے اقلیتیں اپنے آپ کو اپنی تنظیم قربانی اور ایثار کے جذبے کو منظم کرتی ہیں۔ اور وہ یوں اس نظام کو بدل ڈالتی ہیں تو ہمارے ہاں تو یہ ہونا چاہیے کہ الیکشن کے ذریعے سے یا کسی انقلابی تحریک کے ذریعے سے اجتماعی سپرٹ پیدا ہو جائے۔ صرف اس صورت میں اسلام آئے گا انقلاب آئے گا اور پھر کبھی فرقہ وارانہ قسم کے اختلافات اس کے راستے میں نہیں آئیں گے۔

سوال۔ موجودہ طرز کا جو اقتصادی نظام جا رہا ہے اس میں زمینداری اور جاگیرداری نظام بہتر خطوط پر تبدیل کیا جا سکتا ہے؟

جواب۔ یہ تو ایسا ہے کہ آپ لیبل بدل دیں گے مگر شراب نہیں بدلے گی اس لیے کہ ذہنیت نہیں بدلے گی۔ آپ کی سوسائٹی کا جو طاقت کا ڈھانچہ ہے وہ تبدیل نہیں ہو گا لیکن ایک انقلاب کے بعد ایسا ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ سود کا ہے۔ ایک نقد قسم کا سود ہے اور ایک زمین کا سود ہے۔ جسے آپ زمینداری اور جاگیرداری سود بھی کہہ سکتے ہیں۔ درحقیقت ہمارے ہاں سب سے بڑا مسئلہ ہی یہ ہے جس پر ابھی سرے سے توجہ ہی نہیں دی گئی۔ اب اگر آپ صرف فقہ حنفی کے اعتبار سے لیں تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک مزارعت کی ہر شکل حرامِ مطلق ہے بعد میں امام صاحب کے دو شاگردوں نے کچھ شرائط لگا کر مزارعت کے جواز کا فتویٰ دیا لیکن خود امام ابو حنیفہ کے نزدیک وہ حرامِ مطلق ہیں کسی مرحلے پر مسلمانوں نے بزورِ شمشیر فتوحات کیں وہاں کی زمین انفرادی ملکیت ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اُمت کی اجتماعی ملکیت ہے اور اس پر جو کام کرنے والے ہیں ان کی حیثیت مزارعین کی سی ہے لیکن اُن سے خراج وصول نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم خالص فقہ حنفیہ کی روح سے چلیں تو ایک عظیم انقلاب آ سکتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ زمیندار کون ہے؟ اگر کاشتکار ہے تو وہ یقیناً کاشت کرے گا۔ جسے آپ موروثی مزارعت بھی کہتے ہیں۔ یعنی اس میں زمین کی ذاتی ملکیت کا کوئی تصور نہ ہو گا۔ اسلام کے حوالے سے

ہمارے بینک درحقیقت سُود کی دلالی کرتے ہیں

تو یہ ہے کہ قمری حساب سے پاکستان میں چالیسواں سال شروع ہو چکا ہے۔ البتہ شمسی حساب سے ۳۹ برس پورے ہوتے ہیں مگر قمری حساب سے پاکستان کے چالیس برس پورے ہو چکے ہیں۔ لیکن اس مسئلے پر اس اعتبار سے اب تک کوئی معقول معاشی

یا اقتصادی ڈھانچہ نہیں بنایا گیا۔ کیا ضروری ہے کہ ہم بنک کو ایک لازمی جُزو بنائیں جبکہ آپ کے پاس لمیٹڈ کمپنیاں ہیں جن کا اپنا ایک تصور ہے۔ جن سے لوگ لین دین کا کاروبار کرتے ہیں۔ لوگوں کے اُن میں شیئرز ہیں۔ وہ کمپنی جو اچھا کاروبار کرتی ہے اور محنت سے اپنی ساکھ بناتی ہے اُس کے حصص بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جو اس کی اہل ثابت نہیں ہوتیں اُن کے حصص کم ہوتے جاتے ہیں۔ تو وہ جو ہمارے پاس موجود ہے اسی انسٹرومنٹ کے ذریعے سے آپ بڑی سے بڑی انڈسٹری لگا سکتے ہیں اس طرح جو ایک مضاربت کا اصول ہے اس کے تحت کمپنیاں خود بخود چلیں گی۔ کیا ضروری ہے کہ سود کی بنیاد پر پہلے معاشرے کے اندر سے روپیہ اکٹھا کریں اور پھر اس روپے کو جمع کر کے سود کے تحت آگے آپ کمپنیوں کو دیں۔ اس طرح تو ایک اور ادارہ اس کام میں ملوث ہو گیا۔ بینک دراصل سُود کی دلالی کرتا ہے۔ وہ کم ریٹ پر لوگوں سے سیونگ بنک میں روپیہ جمع کرواتا ہے اور پھر اُسے زیادہ ریٹ پر کام کرنے والوں کو دیتا ہے۔ یہ دراصل دلالی ہے کیش کی جس میں سُود دو طرح کا ہوتا ہے۔

سوال۔ مگر ڈاکٹر صاحب باقی دنیا میں بھی تو ایسا ہی نظام ہے ؟

جواب۔ دیکھئے دنیا مدِّنظر رکھتی ہے اپنے اصُولوں اور مفادات کو۔ کوئی بھی ہماری مصلحتوں کو نہیں دیکھے گا۔ کیا کمیونسٹ ممالک ہماری پالیسی کے تابع ہو سکتے ہیں ؟ مگر ہماری زیادہ سے زیادہ تجارت بھی بیرونی ممالک کے ساتھ ہوتی ہے۔ اچھا ہے کہ ہم اس لعنت سے بچیں کیونکہ ہمارے اوپر لوگوں کے حقوق کا بوجھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ہمیں اپنے اندرونی ذرائع پر زور دینا ہوگا اور اس وقت جو مصنوعی خوش حالی قائم ہوگئی ہے اس سے لوگ بچ جائیں گے۔ اس سے آدمی اپنی چادر کے اندر رہ کر پاؤں پسارے گا۔

سوال۔ ڈاکٹر صاحب یہ پاکستان میں جو سیاسی اتحاد یا سیاسی اشتراک ہوا ہے آپ اسے کیا نام دیں گے؟ یہ خالص سوشلسٹ ہے یا جمہوری ؟ میرا اشارہ ایم آر ڈی کی طرف ہے کیونکہ اُس میں دو بڑی سوشلسٹ پارٹیاں موجود ہیں کیا اُن کی موجودگی میں مذہبی جماعتیں اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکیں گی ؟

جواب۔ میں اس کا جواب آپ کو عمومی شکل میں دوں گا۔ آپ ایم آر ڈی کی مثال کو ذہن سے نکال دیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا جو اسلامی انقلابی تحریک ہے اس کیلئے اس قسم کے اتحاد سرے سے غلط ہیں اور اپنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہیں۔ البتہ جو سیاسی پارٹیاں ہوں گی۔ سیاست میں جیسی بھی صورت ہے وہ اصل شے ہوتی ہے جو اُن کی پالیسی کو بناتی ہے ــــ سیاست میں ہمیشہ یہی چلتا ہے کہ اس وقت کس پوزیشن کو اختیار کر کے اپنی پالیسی اور لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ اب تک ہمارے ہاں جو سیاسی اتحاد قائم ہوئے وہ بھی اسی بنیاد پر وجود میں آئے تھے۔ ایک زمانے میں یہ کہا گیا تھا کہ صدر ایوب تمام بُرائیوں کی جڑ ہیں وہ ہٹ جائیں گے تو معاملہ درست ہو جائے گا۔ لہٰذا اُن کو ہٹانے کے لیے مختلف قسم کے اتحادات وجود میں آئے۔ میں اس کو بھی غلط سمجھتا ہوں۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اگرچہ اُس تحریک میں بعض اسلامی جماعتیں بھی شامل تھیں۔ اس کے بعد سب لوگوں نے یہ سمجھا کہ بھٹو غاصب ہے اسے ہٹاؤ۔ لہٰذا ہمارے لیڈر محض بھٹو کو ہٹانے کے لیے ایک محاذ پر متحد ہوئے کہ پہلے اسے ہٹاؤ پھر آپس میں بھی دیکھ لیں گے۔ جیسے کہ برِصغیر کے نیشنلسٹ علماء کا خیال تھا کہ آزادی کے لیے ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد دوسرے مسائل حل کر لیں گے۔ یہ روّیہ سیاست کے اندر ہمیشہ رہتا ہے اور یہی روّیہ ہمارے ہاں ایوب خان اور بھٹو کے خلاف تحریکوں میں بھی موجود رہا۔ اب یہی چیز اینٹی مارشل لاء ہے کہ پہلے اسے ہٹاؤ۔ اس سلسلے میں ان کے پاس دلائل بھی موجود ہیں کہ مارشل لاء اس ملک کو ختم کر دے گا۔ توڑ کر رکھ دے گا۔ اس کے اندر صوبوں کا احساس محرومی بڑھتا جائے گا۔ یہی وہ روّیہ ہے جس نے مشرقی پاکستان کو ہم سے علیحدہ کیا۔ یہی روّیہ سندھ میں تعصبات کی تحریکیں پیدا کر چکا ہے۔ ایسا دوبارہ ہوا تو پاکستان اس کا متحمل نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس وقت مل جل کر پہلے مارشل لاء ختم کریں پھر آپس میں نبٹیں گے۔

اسلامی انقلاب نہ آیا تو خدانخواستہ پاکستان قائم نہ رہے گا

سوال۔ ڈاکٹر صاحب کیا بہتر نہ ہوتا اگر اسلامی جماعتیں اپنے نظریات کی بُنیاد پر متحد ہوتیں۔ اس طرح ایک متحدہ محاذ بنا کر وہ غلط قسم کے نظامِ حکومت کو درست کرانے میں بھی کامیاب ہو جاتیں ؟

جواب۔ اگر یہ ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا لیکن نہ یہ ہوا اور نہ اس کی توقع ہے جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے لہٰذا اگر کسی مذہبی جماعت نے ایم آر ڈی کے ساتھ اشتراک کیا ہے تو وہ بھی اسی فلسفے کی بُنیاد پر ہے اور اگر کسی مذہبی جماعت نے صدر ضیاءالحق کو سپورٹ کیا تو وہ بھی اُسی بدترین بُنیاد پر ہے لیکن اگر کوئی ایسی تحریک چل پڑی کہ روس یا بھارت نے پاکستان کو

(بقیہ صہ ۱۴۲ پر)

کارمینا
نظامِ ہضم کو بیدار کرتی ہے،
معدے اور آنتوں کے افعال کو
منظم و درست کرتی ہے۔
Carmina
ہمدرد
ہم تندرستی تخلیق کرتے ہیں
کارمینا ہمیشہ گھر میں رکھیے۔
بہترین انسان وہ ہے جس کا وجود انسان کے لیے مفید ترین ہو۔
Adarts

افکار و آراء

بقائے اُمّت کا راز

اہلِ علم تو بخوبی جانتے ہیں کہ تقلید ائمہ کی حیثیت شریعت میں کیا ہے۔ ضرورت ان کم علم حضرات کو سمجھانے کی ہے جو تقلید میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ اپنے گروہ کے علاوہ دوسرے گروہ کے لوگوں کو گمراہ، بے دین اور اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ یا علمائے سلف کی آراء، اجتہاد اور تحقیق ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھے ہیں۔ ایسے لوگوں پر یہ حقیقت واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ آپ جس امام، مجتہد پر اعتماد کریں، اُس کی تحقیق سے فائدہ اٹھائیں اور اُس کی پیروی کریں مگر یہ سمجھکر کہ آپ کی یہ پیروی دراصل اللہ اور اُس کے رسول کی پیروی کے لئے ہے نہ یہ کہ خود ائمہ کی۔ تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ یہ سب مومن ہیں، مسلمان ہیں اور ان کے درمیان کوئی کدورت، بغض و عناد نہیں ہے۔ عبادات و معاملات میں تحقیق، تعبیر اور تشریح سے، اصولِ شریعت سے جزئیات میں، استنباط کرنے سے وہ خود آمر و ناہی نہیں بن گئے نہ ہی مطاع و متبوع۔ اگر یہ اصل ہمارے محترم مسلمان رہنما سمجھ لیں اور اپنے حلقہ اثر میں عوام کو یہ بات سمجھا دیں تو مسلمان بھائیوں کے درمیان تمام جھگڑے ختم۔ جھگڑے تو حق کو اپنے ہی فرقے میں محدود کر دینے سے شروع ہوتے ہیں اور اسی پر مذہب و مسلک کی بنیادیں رکھ دینے سے دلوں میں دوری اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔ نمازیں علیحدہ، شادی بیاہ ممنوع اور میل جول ختم ہو جاتا ہے۔ مسجدیں علیحدہ ہو جاتی ہیں، تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں اور مسجدوں پر مسلکوں کی چھاپیں لگ جاتی ہیں اور قبضے کے لئے مقدمے اور ڈنڈے چلنے لگ جاتے ہیں اسی بے بنیاد اور لایعنی تشدد نے بیت اللہ میں چار چار مصلے بچھوائے، ایک اللہ کے گھر میں، ایک ملت سے، ایک وقت میں چار اماموں کے پیچھے نمازیں ادا کرائیں، ایک حنفی امام، ایک شافعی امام، ایک مالکی امام اور ایک حنبلی امام۔ کیسی بدنصیبی اور کوتاہ اندیشی تھی کہ اللہ کے بندوں کو ایک ساتھ تکبیر کہنے، ایک ساتھ قیام، رکوع اور سجدہ کرنے سے روک دیا۔ سوچیں کہ اگر یہ ائمہ بزرگ ایک ہی وقت میں بیت اللہ میں جمع ہوتے تو وہ کیا ایسے ہی علیحدہ علیحدہ نمازیں پڑھتے۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں وہ ایسا ہرگز نہیں

کرتے اُن کے تو حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ فقہی و جزوی مسائل کے حل سے پوری امت مسلمہ یوں فرقوں میں بٹ کر ایک دوسرے کی تحقیر، تکفیر اور تذلیل کرے گی۔ خدا شاہ سعود فیصل بن عبدالعزیز کو اس بابرکت عمل پر جنت الفردوس میں اعلیٰ و ارفع مقام عطا فرمائے کہ انہوں نے افتراق و انتشار کی اس بساط ہی کو لپیٹ دیا اور صرف ایک مصلّٰی باقی رکھا۔ آج اسی عمل کی بدولت خانۂ خدا یعنی کعبۃ اللہ میں ایک ہی امام کے پیچھے پوری امت مسلمہ نمازیں ادا کرتی ہے۔

اثنا عشری ۱۲ اماموں کے تعلق سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ مامور من اللہ تھے تو لازمی نہیں ہے کہ اہل سنت بھی اپنا یہ عقیدہ بنالیں کہ ائمہ اربعہ مامور من اللہ تھے اور اُن کی اطاعت کرنا ضروری ہے ورنہ اسلام اور ایمان نامکمل رہ جاتا ہے۔ اگر اہل سنت بھی اپنا یہ عقیدہ بنالیں تو پہلی صدی ہجری کے وہ مسلمان جو ان ائمہ کی پیدائش سے پہلے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری میں جانیں کھپا گئے وہ کیا تھے۔ کیا وہ مسلک نبوی کے پیروکاروں کے علاوہ کچھ اور بھی تھے یعنی کہ حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی وغیرہ وغیرہ۔ اگر نہیں تو سیدھی بات یہ ہے کہ مسلمان تھے اور بس۔ یہی اُن کا دین، یہی مذہب اور یہی مسلک تھا۔

پاکستان کے قیام سے پہلے تو بات صرف ائمہ اربعہ اور اُن کے مسلکوں ہی کی تھی لیکن وہ تشدد کہیں دیکھنے میں نہیں آیا تھا جو اس پُرآشوب دور میں خود احناف ہی میں مزید مسلکوں کی تقسیم سے دیکھنے میں آیا ہے۔ یعنی مسلک دیوبندی و مسلک بریلوی۔ اِن مسلکوں کی تقسیم در تقسیم نے تو وہ کمال دکھا دیا ہے کہ ایک غیر مسلم کو یورپ، امریکہ یا افریقہ میں اسلام کو سمجھنے کے لئے پہلے مذہب یا دین کو نہیں بلکہ مسلک کو اپنانا پھر تحقیق و جستجو میں اپنی عمر کا قیمتی سرمایہ صرف کر کے اس نتیجہ تک پہنچنا کہ وہ ایک مسلک کو اپنائے تو دوسرے مسلک کے واسطے قابل گردن زدنی، مشرک اور کافر اور دوسرے کو گلے سے لگائے تو پہلے کے نزدیک گمراہ، بے دین منافق اور گستاخ ٹھہرے۔ وہ سوچے گا کہ یا اللہ یہ کیسا دین ہے جس کے ماننے والوں کو اُن کی مقدس کتاب میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور ہرگز ہرگز تفرقوں میں نہ پڑو۔ ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور تم تباہ ہو جاؤ گے مگر ان کے علماء ایک گروہ کے ساتھ دوسرے گروہ پر حملہ کرتے ہیں اور اسے بڑے ثواب کا کام تصوّر کرتے ہیں۔ وہ اُس وقت اور متحیّر ہوگا جب مسجدوں کے

ممبروں سے اللہ کے حضور دُعا کرنے والے یہ دعا بھی کریں گے کہ اے اللہ مسلمانوں میں محبت و اتفاق دے جبکہ ابھی چند لمحوں قبل ہی اسی ممبر سے یہ تقاریر بھی اس کے ذہن میں گردش کر رہی ہونگی کہ فلاں گروہ مشرک، فلاں کافر، فلاں گمراہ اور ایسا ویسا ہے!

؎ "زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں"

پوری دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو مسلمانوں کے درمیان اس قسم کی گروہ بندیوں سے نالاں ہیں۔ مگر وہ اس قدر بے بس، بے اثر اور بے آواز ہیں کہ جن کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ انفرادی کوششوں سے یہ فرقہ بندیاں کم نہیں ہو سکتیں۔ انہیں منظم ہو کر ان کے خلاف جدوجہد کرنا ہوگی اور اُن علماء کرام کو ساتھ لینا ہوگا بلکہ انہی کی رہنمائی میں یہ کام کرنا ہوگا جو اس صورت حال سے پریشان ہیں اور اس کے مضر اثرات سے اسلام، مسلمان اور دُنیائے انسانیت کو بچانا چاہتے ہیں۔ ہر چند کہ کام بڑا کٹھن اور صبر آزما کام ہے جس کے لئے اُمت مسلمہ کا درد رکھنے والے صاحب علم و عمل علماء ہی کو پیش قدمی کرنا ہوگا۔ تنگ نظر، کم علم قدم قدم پر رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کریں گے کیونکہ اتحاد بین المسلمین ان کے مفادات کے خلاف ہے مگر حکومت اور وہ عوامی سیاسی جماعتیں جن کی بنیاد اسلام کا نظامِ حیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا عملی قیام ہے تعاون کریں تو یہ بہت آسان بھی ہے۔ نظامِ مصطفےٰ اُس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے ماننے والے یا مدعی اُس کے نفاذ میں مخلص نہ ہوں اور ایک قابل لحاظ تعداد ایسے افراد کی اُس معاشرہ میں موجود نہ ہو جن پر یہ نظام نافذ کیا جا رہا ہے۔ مثلاً اسلام سے اخلاص کا منہ بولتا ثبوت جمعیت علماء اسلام، جمعیت علماء پاکستان اور جماعتِ اسلامی وغیرھا اپنے اپنے پلیٹ فارموں سے اس طرح پیش کر سکتے ہیں کہ دیوبند اور بریلی کی زبان میں بات کرنے کے بجائے مکہ اور مدینہ کی زبان میں بات کریں۔ اور مسالک پر لوگوں کو اکٹھا کرنے کے بجائے دینِ اسلام پر جمع کریں جس میں سکڑنے کی نہیں پھیلنے کی صلاحیت ہے، جمود کی نہیں تحریک کی قوت ہے اور اسی میں اُمت مسلمہ کی بقاء کا راز مضمر ہے!

محمد صدیق خان

منکرینِ سنّت کے

عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی پر

اعتراضات کا مسکت و مدلل جواب

"عید الاضحیٰ"

— اور —

"فلسفۂ قربانی"

کتاب میں ملاحظہ فرمائیے جو

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ایک تقریر اور ایک تحریر پر مشتمل ہے۔
آفسٹ سفید کاغذ۔ عمدہ طباعت۔ صفحات ۴۸
قیمت چار روپے صرف
تنظیم اسلامی کے مقامی تمام مکتبوں
سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

— ناشر —

مرکزی انجمن خدام القرآن۔ لاہور ۱۴

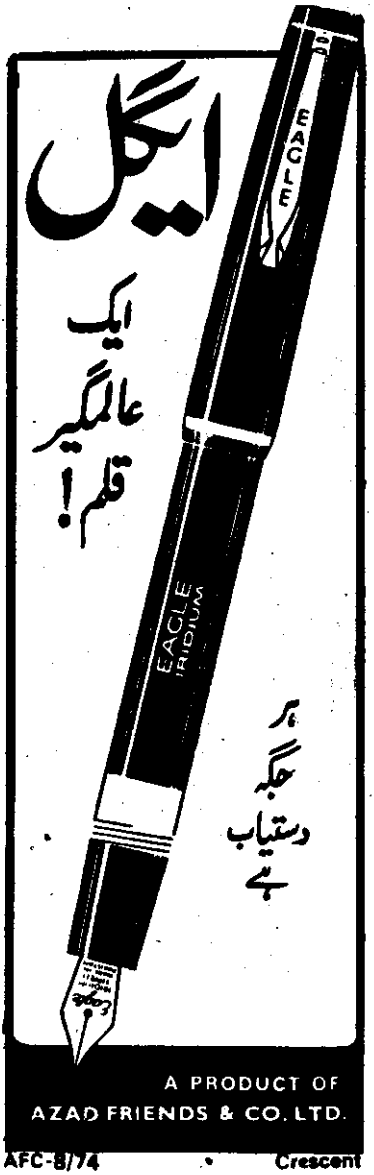

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحمدُ لِلّٰہِ

ایک اور اعزاز

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے گزشتہ سالوں کی طرح ۱۹۸۲-۸۳ء کے دوران
بھی ہماری بہترین برآمدی کارکردگی اور وطن عزیز کے لیے کثیر زرمبادلہ کمانے پر فیڈریشن آف
پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی جانب سے ہم ایک بار پھر

بہترین برآمدی کارکردگی کی ٹرافی

کے مستحق قرار پائے

یہ ٹرافی جناب جنرل محمّد ضیاء الحق صاحب صدر پاکستان نے ایک پُروقار تقریب میں اپنے ہاتھوں سے ہمیں عطا فرمائی۔

ہمیں خیمے۔ ترپالیں اور کینوس کی دیگر مصنوعات کے سب
سے بڑے برآمدکنندگان ہونے کا بجا طور پر شرف حاصل ہے۔

SNDS

حاجی شیخ نورالدّین اینڈ سنز لمیٹڈ

پاکستان میں جنوس مصنوعات کے سب سے بڑے برآمدکنندگان

ہیڈآفس: حفیظ چیمبرز، ۸۵۔ شاہراہ قائدِ اعظمؒ لاہور (پاکستان)
فون: ۳۰۲۴۶۸ - ۳۰۵۴۶۹، تار: شاہی خیمہ ٹیلکس: 44543 NOOR PK
ایکسپورٹ آفس: ۶۱۶ - ۶۱۴ کامرس سینٹر، چھٹی منزل، حسرت موہانی روڈ۔ کراچی (پاکستان)
فون: ۲۱۳۵۴۰ - ۲۱۴۳۸۲، تار: 'TARPAULIN' ٹیلکس: 25480 NOOR PK

Regd. L. No. 7360

MONTHLY "MEESAQ" LAHORE

Vol. 34 | OCTOBER 1985 | No. 10

Siddiq Sons Industries Ltd.

Largest Manufacturers & Exporters of :

WATERPROOF COTTON CANVAS, TARPAULINS, TENTS, WEBBING AND OTHER CANVAS PRODUCTS,

HEAD OFFICE :

5-C, 5th FLOOR, SIDCO EVENUE CENTRE
264-R. A. LINES, KARACHI (PAKISTAN)

2 - K GULBERG II, SHAHRAH-E-IQBAL, LAHORE.
TELEFHONE : 870512 880731